اردو صحافت

اور

سر سید احمد خاں

عبدالحئی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ٦

☆ یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی۔

☆ اس کتاب کے مشمولات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

URDU SAHAFAT

AUR

SIR SYED AHMED KHAN

by

Abdul Hai

231, Periyar Hostel, JNU

New Delhi-110067, Mob: 9899572095

year of 1st Edition-2008

ISBN 978-81-8223-458-1

Price Rs.130/-

کتاب کا نام	:	اردو صحافت اور سرسید احمد خاں
مصنف وناشر	:	عبدالحیٔ
سال اشاعت اوّل	:	۲۰۰۸ء
تعداد	:	۴۰۰
قیمت	:	۱۳۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan,Delhi-6(INDIA)

Ph:23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

website: www.epbooks.com

انتساب

اپنے والدین کے نام

جن کی دعائیں میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئیں

فہرست

تبریک

عوامی ذرائع ابلاغ میں صحافت کو اولیت حاصل ہے اور ہر دور میں اس سے معاشرے کی تربیت، قیام امن، اقدار کا تحفظ، عوامی حقوق کی حفاظت اور رائے عامّہ ہموار کرنے اور متاثر کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ سماجی زندگی کو مثبت سمت عطا کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

صحافت کے بارے میں ابتداء سے ہی مختلف نظریات گشت کرتے رہے ہیں۔ کچھ اسے صرف تجارت یا پیشے کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں مگر زیادہ لوگوں کا ماننا ہے کہ کسی اعلیٰ مقصد کو نصب العین بنا کر صحافت کے میدان میں قدم جمائے رہنا ہر حال میں قابل احترام ہے۔ جس کے تحت صحافی سماج کو مستعد اور چوکنا رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور سماجی اصلاح و بہبود اس کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

سرسید احمد خاں بھی ایک ایسی ہی قابل احترام شخصیت ہیں۔ ان کی صحافت بھی ایک مشن تھی، جس کا ایک مقصد تھا۔ جس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا ہوا لائحہ عمل تھا۔ دراصل سرسید احمد خاں تہذیبی سماجی مسائل اور بیجا رسم و رواج کی اصلاح و تعلیمی بیداری کے ذریعے ہندستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو زوال اور پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے صحافت کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی وجہ سے صحافت کا بھی ارتقاء ہوا اور اسے ادبی وقار حاصل ہو گیا۔

مگر سرسید کی صحافت پر ابھی تک اس نقطہ نظر سے بہت کم کام ہوا ہے۔ عبدالحیٔ نے زیر نظر کتاب میں اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ عبدالحیٔ جس کام کو کرتے ہیں پوری لگن، محنت اور سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ اس کتاب کی تخلیق میں ان کی یہ خصوصیات نمایاں ہو رہی ہیں پھر بھی اس کو مزید بہتر بنانے کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوتے ہیں۔ گو کہ یہ ان کے عشق کی ابتداء ہے۔ پھر بھی زبان صاف اور اسلوب رواں ہے۔ مزید یہ کہ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ ایک اہم کام ہے اور ابلاغیات پر کام کرنے کی کم ہی لوگ ہمت کر پاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کتاب صحافت کی درس و تدریس میں بھی معاون ہوگی اور عام قاری بھی اس سے مستفیض ہوں گے۔

محمد شاهد حسین
پروفیسر، ہندستانی زبانوں کا مرکز
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

پیش لفظ

انسانی زندگی میں ازل سے ہی کچھ نیا کرنے اور کائنات کے سربستہ راز جاننے کا جذبہ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ اور شدت اختیار کرتا گیا۔ سماجی بھائی چارے نے انسان کو ایک دوسرے سے واقف رہنے پر مجبور کیا اور دھیرے دھیرے انسان نے ساری دنیا سے باخبر رہنے کا ذریعہ ایجاد کرلیا۔ انسان کی یہ جبلت ہی انسان کی ترقی کی محرک بنی اور انسان کا یہی اضطراب ترسیل وابلاغ کے نئے نئے وسائل ایجاد کرنے کی وجہ بنا۔ انسانی معاشرے کی ترقی میں بے شمار فنون اور انسانی کوششوں کا ہاتھ رہا ہے۔ صحافت بھی ایسی ہی ایک کوشش ہے جس نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے قریب لانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آج صحافت ہمارے معاشرے کا ایک آئینہ بن چکی ہے جو ہمارے معاشرے میں ہورہا ہے وہ ہم اخبار ورسائل کے ذریعہ جان لیتے ہیں۔ انسان دنیا کے ایک کونے میں رہتے ہوئے دوسرے کونے کی خبریں بڑی آسانی سے جان لیتا ہے۔ صحافت معاشرے کی، سماج کی سچی ترجمانی کرتی ہے اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو اجاگر کر کے عوام کے سامنے لاتی ہے۔ آج صحافت اتنی مقبول ہوچکی ہے کہ ہم اپنی صبح کی شروعات اخبار سے کرتے ہیں۔

ہندوستان میں دیگر زبانوں کی صحافت کی طرح اردو صحافت کا بھی اپنا مقام ہے اور اپنا کردار ہے۔ اردو صحافت نے بھی ہندوستان کے تمام سیاسی انقلابات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو صحافت کی بھی اپنی ایک تاریخ رہی ہے اور اپنا وجود رہا ہے۔ اردو صحافت جو 'جام جہاں نما' سے شروع ہوکر 'راشٹریہ سہارا' اور 'اعتماد' تک نہ جانے ترقی کی کتنی منازل طے کرچکی ہے۔ اردو صحافت کو آج عالمی سطح پر لانے میں مختلف صحافیوں نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں مولوی محمد باقر، ماسٹر رام چندر، منشی نول کشور، سرسید احمد خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، حیات اللہ انصاری، مولانا عبدالوحید صدیقی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی ملک کی صحافت ہو، وہ ملک کی سیاسی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اردو صحافت نے بھی ہر دور میں ملک کی سیاسی اتھل پتھل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد جب کہ ہندوستانی عوام بے حسی اور بے بسی کی زندگی جینے پر مجبور تھے چاروں طرف جاہلیت اور انگریزی حکومت کا سیاہ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایسے وقت میں سرسید احمد خاں نے ہندوستانی عوام خاص طور سے مسلمانوں کی پسماندگی کو دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ اگر وہ وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تو مفلوج ہوجائیں گے اور پورا مسلم طبقہ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔ یہی سب سوچ کر انھوں نے صحافت کو ذریعہ بنایا اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے کی کوشش شروع کی۔ آج مسلمان جہاں بھی ہیں جس مقام پر ہیں اس میں سرسید کی کوششوں کا سب سے زیادہ عمل دخل ہے۔ سرسید احمد خاں نے اردو صحافت کو نئی سمت عطا کی اور اردو صحافت جو اس سے پہلے گھٹنوں کے بل چل رہی تھی وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر دوڑنے لگی۔ انھوں نے اردو صحافت کو جدید اصولوں سے روشناس کرایا اور اپنے اخبارات ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ معاشرے میں انقلاب برپا کردیا۔

چونکہ صحافت سے مجھے کافی دلچسپی رہی ہے۔سر سید احمد خاں سے مجھے ابتدائی تعلیم کے دوران سے ہی عقیدت ہے اور مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میں نے ایسی عہد ساز شخصیت کی صحافت پر بالخصوص رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے تعلق سے قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔سر سید کی صحافت پر اصغر عباس کی کتاب ہے لیکن اس میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے کام کیا گیا ہے۔دوسری کتاب ڈاکٹر نفیس بانو کی ہے جس میں انھوں نے تہذیب الاخلاق کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں اردو صحافت اور سر سید احمد خاں کا مقام پیش کیا گیا ہو۔

میں نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں صحافت کی تعریف و تاریخ ہندوستانی صحافت اور اردو صحافت کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں سر سید کی صحافت کا جائزہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، رفیق ہند اور دوسرے اخبارات کی روشنی میں لیا گیا ہے۔تیسرے باب میں سر سید کے اہم رسالے تہذیب الاخلاق اور اردو صحافت میں اس کے مقام پر بحث کی گئی ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کوئی بھی تحریر حرف آخر نہیں ہوتی تاہم میں نے موضوع سے انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ان تمام باتوں کے باوجود مجھے اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم اور بسیط موضوع کے لیے جتنی محنت اور ریاضت کی ضرورت تھی شاید میں اسے کماحقہ پورے طور پر ادا نہیں کر سکا ہوں۔میں نے اس کتاب کو مکمل کرنے میں تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اصل فائلوں سے مدد لی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر اصغر عباس اور محترم نادر علی خاں کے مشوروں اور آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔میرے نگراں استاد محترم پروفیسر محمد شاہد حسین صاحب نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی اور کتاب کو مکمل کرنے میں ہر ممکن مدد فراہم کی اور اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اس کتاب پر چند سطریں لکھنے کی زحمت فرمائی۔ان کے علاوہ شعبے کے دوسرے اساتذہ محترم انوار عالم پاشا، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر مظہر مہدی اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے بھی کتاب مکمل کرنے میں کافی تعاون کیا۔ یہاں میں خاص طور سے ڈاکٹر شہزاد انجم ، ریڈر، شعبہء اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا ذکر کرنا چاہوں گا جن کی مدد کے بغیر کتاب مکمل کرنا میرے لئے بہت مشکل ہوتا۔انہوں نے میری ہر قدم پر ہمت افزائی کی اور کتاب کو مکمل کرنے میں ہر ممکن تعاون فراہم کیا۔محترمی ڈاکٹر کوثر مظہری، شعبہء اردو جامیہ ملیہ اسلامیہ نے بھی کتاب کی تکمیل کے آخری مراحل میں مدد فرمائی۔ان کا شکر بھی بجا ہے۔

ان کے علاوہ دوستوں اور کرم فرماؤں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے مجھے کتاب کی تکمیل میں مدد دی ہے۔ان میں محمد کاشف، محمد فاروق ، فیض، امتیاز عالم ، جاوید اختر، محمد جہانگیر، محمود عالم ، مہیمنہ خاتون ، شاہجہاں ، محمد محفوظ الرحمٰن ، منتظر قائم ، ڈاکٹر علاء الدین ، خالد رضا، ڈاکٹر شجاع الدین قمر خاں کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ان کے علاوہ خاص طور سے سماویہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو مجھ سے دور ہوتے ہوئے بھی مجھے میرے کام کی طرف توجہ دلاتی رہیں اور میں اپنے کام کو جلدی پورا کر سکا۔ اپنی حد درجہ مصروفیت کے باوجود ڈاکٹر ہادی سرمدی نے کتاب کے لئے پروف ریڈنگ کی۔ڈاکٹر مخمور صدری نے بھی اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔

میرے سامنے میرے والدین ، اعزا و اقربا کے وہ تمام چہرے ہیں جنہوں نے ابتدائے عمری سے ہی مجھ میں لکھنے پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کیا آج اُن سبھوں کی بے حد یاد آتی ہے۔ بالخصوص نانا محترم مرحوم منظور عالم خاں صاحب کو میں تاعمر نہیں بھلا سکتا۔جن کی شفقت اور محبتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔

شکر، شکر اور شکر۔ بارہا شکر۔ خداوند رب العزت کا جس نے ہمیں پیدا کیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ ہر پل اس کا ہی شکر۔

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے کارکنان نے بھی میری کافی مدد کی اور 'تہذیب الاخلاق کی فائلیں دستیاب

کرائیں۔اس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی لائبریری، دہلی یونیورسٹی کی لائبریری، دہلی پبلک لائبریری اور جے این یو کی لائبریری سے میں نے کافی مدد حاصل کی ہے۔

عبدالحئی
۸/ اگست ۲۰۰۸ء
۲۳۱ ، پیریار ہاسٹل
جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی۔۱۱۰۰۶۷

نوٹ۔جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی تو اسمیں کمپوزنگ کی کچھ غلطیاں رہ گئی تھیں۔انٹرنیٹ ایڈیشن کے لئے اس میں کافی اصلاح کی گئی ہے اور اڈیٹنگ کے بعد اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو صحافت: تعریف و تاریخ

آج کے اس برق رفتار دور میں ذرائع ابلاغ انسانی زندگی میں ایک لازمی حصے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذرائع ابلاغ یا عوامی ذرائع ترسیل آج ہماری زندگی میں ایک ضرورت کی شکل میں شامل ہو چکی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام حواس اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ذرائع ابلاغ کی ہی کرشمہ سازی ہے کہ پلک جھپکتے ہی کسی واقعے یا حادثے کی خبر پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ چاہے قدرتی آفات ہوں یا انسانی ظلم و بربریت کے دل آزار کارنامے۔ ان تمام پر سماج کا ہر طبقہ یک زبان ہو کر بول اٹھتا ہے۔ اپنی اس متاثر کن خاصیت کے سبب صحافت آج جمہوری نظام میں چوتھے ستون کا درجہ رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی اور اکیسویں صدی کی ابتدا میں صحافت دو خیموں میں تقسیم ہو گئی جس کو ہم پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا نام دینے لگے۔

یہ سچ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں تھوڑی زیادہ کشش ہے اور یہ سماج میں زیادہ مقبول ہے لیکن پرنٹ میڈیا کی اپنی الگ خصوصیات ہیں اور آج نیوز چینل کی توسیع کے ساتھ ساتھ اخبارات کی بھی توسیع ہوتی رہی ہے۔ اور آج یہ پرنٹ میڈیا یا اخباری صحافت بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔

آج کے دور میں واقعات یا حقائق جاننے کا نام صحافت ہے۔ سچائی اور انکشافات کا پتہ لگانا ہی صحافت ہے۔ عوام کو سچائی اور تمام واقعات سے باخبر رکھنا صحافت ہے۔ صحافت کا سب سے پہلا فرض سچائی ہے۔ سچائی پر ہی صحافت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

صحافت کی تعریف مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ لیکن سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ سب سے پہلے اس کے لغوی مفہوم پر دھیان دیا جائے۔ یہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جاوید حیات ''مبادیات صحافت'' میں لکھتے ہیں۔

> ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر صحافت کسے کہتے ہیں؟ اس سلسلے میں جب ہماری نگاہیں اس کے لغوی معنی و مفہوم کی طرف جاتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عربی النسل ہے اور اس کا ماخذ صحیفہ ہے۔ جس کے معنی کتب و رسائل کے ہیں۔'' [۱]

سید صفی مرتضٰی نے اپنی کتاب ''اصناف ادب کا ارتقا'' میں اس کی مزید تشریح کی ہے۔

> ''اس کے معنی کتاب یا نامہ کے ہیں اور اس کا کام ترسیل و ابلاغ، افکار و نظریات اور خیالات ہے۔'' [۲]

عبدالسلام خورشید اپنی کتاب ''فن صحافت'' میں لکھتے ہیں۔

> ''صحافت کا لفظ صحیفے سے نکلا ہے۔ صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ بہر حال عملاً ایک عرصے دراز سے صحیفہ سے مراد ایک ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقتوں پر شائع ہوتا ہے چنانچہ تمام اخبارات و رسائل صحیفہ ہیں۔'' [۳]

اس کو اور بہتر طریقے سے ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے اپنی کتاب ''ابلاغیات'' میں واضح کیا ہے۔

> ''صحافت خبر ہے، اطلاع ہے، جانکاری ہے۔ صحافت عوام کے لئے عوام کے بارے میں تخلیق کیا گیا مواد ہے۔ یہ دن بھر کے واقعات کو تحریر میں نکھار کر آواز میں سجا کر تصویروں میں سمو کر انسان کی اس خواہش

کی تکمیل کرتی ہے۔جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لئے بے چین رہتا ہے۔''۴

انگریزی میں صحافت کے لئے Journalism کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو لاطینی لفظ diurnal سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور انگریزی میں Journal استعمال ہوتا ہے۔ Oxford Dictionary میں Journal کے معنی A Daily newspaper، record of daily transition کے دیئے گئے ہیں۔۵

ان سبھی لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت، صحیفہ نگاری ہے اور Journalism یا صحافت کی تعریف بھی صحیفے یا Journal سے ملتی جلتی ہے۔ صحیفے کے معنی و مفہوم سے صحافت کی تفسیر و تفہیم میں رہنمائی ملتی ہے۔

''رہبر اخبار نویسی'' میں سید اقبال قادری نے صحافت کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا آف امریکانا کے مطابق:

"Journalism is the collection and periodical dissemination of current news and events or more strictly the business of managing, editing or writing for journals & newspapers."6

یعنی مقررہ وقت میں تازہ خبریں اور واقعات کو جمع کرنے کا نام صحافت ہے۔ یہ ایسا شغل ہے جس میں پورے انصاف کے ساتھ اخباروں اور جریدوں کے لئے خبریں تحریر و مرتب کی جاتی ہیں۔ اخبارات کو سچائی اور انکشافات سے بھری ہوئی خبریں دینے کا نام صحافت ہے۔ اس بارے میں عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے۔

جرنل کی ترتیب دینے والوں کے لئے جرنلسٹ کا لفظ بنا اور اس پیشے کو جرنلزم کا نام دیا گیا۔''۷

ایم وی کامتھ اور ایم کے رستم جی لکھتے ہیں۔

"Journalism means several things. First of all, it means the ability to write and to convey thoughts in a way that people will understand quickly.

Journalism also means a nose for news and feel for words, respect for truth and a sense of mission."8

یہاں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ صحافت میں حقیقت اور سچائی سب سے اہم چیزیں ہیں۔ اور انہیں بہتر الفاظ میں ڈھالنا ایک فن ہے۔ کسی بھی خبر کو بہتر الفاظ میں ڈھال کر اس طرح بھی شائع کرنا جو لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آجائے، صحافت ہے۔

ڈیوڈ وین رائٹ نے اپنی کتاب ''جرنلزم میڈ سمپل'' کی شروعات میں ہی لکھا ہے۔

"What is journalism? Journalism is information. It is Communication. It is the events of the day distilled into a few words, sounds or pictures. Journalism is basically news. "9

جارج برنارڈ شا تمام اعلیٰ ادب کو صحافت کا درجہ دیتے ہیں۔ "All great literature is Journalism" تو دوسری طرف میا فیو آرنلڈ نے صحافت کو جلدی میں لکھا ہوا ادب قرار دیا ہے۔ "Journalism is a literature in hurry." لیکن یہ تعریف کچھ صحیح نہیں کہی جا سکتی۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے اپنی کتاب ''ابلاغیات'' میں لکھا ہے۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ تعریف بہت سے لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہو۔ کیونکہ لفظ عجلت میں پوشیدہ تحقیری عنصر بالکل پوشیدہ بھی نہیں۔اوراس امکان سے یکسر انکارنہیں کیا جاسکتا کہ عجلت میں لکھی گئی تحریریں بھی معیاری ہوسکتی ہیں۔''۱۰

ڈاکٹر محمد شاہد حسین کی اس بات سے صاف ہوجاتا ہے کہ صحافت میں وقت کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔اور وقت پر صحافیوں کو چیزیں دے دینی ہوتی ہیں لیکن ایسی عجلت میں صحافت کے فن کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اچھی خبریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک ادب اور صحافت کے تعلق کی بات ہے تو شروع سے ہی عیاں ہے کہ صحافی اور ادیب ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ایک اچھا صحافی اچھا ادیب بھی ہوتا ہے اور ایک اچھا ادیب اچھا صحافی بھی ہوسکتا ہے۔ملاحظہ ہو۔

''صحافت میں بھی کہیں کہیں ایسے مقام آتے ہیں جہاں ادب اور صحافت ایک ہوجاتے ہیں۔ پھر اخبارات میں لکھے گئے کالم اور مضامین عموماً ادیبوں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔رسالوں میں تو زیادہ تر ادیب ہی لکھتے ہیں لہذا ادب اور صحافت کے درمیان کوئی سیدھی لکیر نہیں کھینچی جاسکتی ہے۔''۱۱

صحافت کی ایک تعریف ایکسپلورنگ جرنلزم کے مصنفین لارنس آرکیمپبل اور رولینڈ نے اس طرح کی ہے۔

"Journalism is the systematic and reliable dissemination of public information,public opinion and public entertainment by modern mass media of communication."12

یعنی جدید ذرائع ابلاغ، اخبار ورسائل، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن جیسے موثر ذرائع سے حالیہ دلچسپی سے متعلق امور کی پیش کش کی خاطر مواد اکٹھا کرنا اور نوک پلک درست کرکے ان کو نشر واشاعت کے قابل بنانے کے عمل کا نام صحافت ہے۔

صحافت ایک ایسا فن ہے جس میں بہت کچھ کیا جاسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اپنی تخلیقی قوتوں کو ابھارا جائے اور انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور میں اخبارات کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔صحافت کو حکومت کے چوتھے ستون کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔کسی بھی جمہوری ملک کے نظام مملکت میں صحافت کو اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ اخبارات ہی عوام کی رائے کو عوام کے سامنے لاتے ہیں۔حکومت کا تختہ پلٹنا ہو۔مجرموں کو سزا دینا ہو یا نئے حکمراں کا انتخاب کرنا ہو۔ان باتوں میں اخبارات سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اخبارات ہمیں قانون کا احترام کرنا سکھاتے ہیں،لیکن صحافت کا دائرہ کار محض اخبار نویسی تک نہیں ہے بلکہ ریڈیو،فلم، ٹیلی ویژن کے وہ حصے بھی اس کی حدود میں شامل ہیں جن کے لئے مدیر کی ضرورت ہوتی ہے جو خبروں،عوامی دلچسپی سے متعلق اموراور دیگر نظریات وخیالات کو اس طرح تحریر سے سجاتے ہیں کہ ان کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر نشر کیا جاسکے۔صحافت کا میدان ایک ایسا میدان ہے جہاں قلم کی جنگ لڑی جاتی ہے۔اور کسی بھی ملک کی جنگ کا انحصار اس ملک کی صحافت پر بھی ہوتا ہے۔جیسا کہ نذرالحفیظ ندوی نے اپنی کتاب ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات میں لکھا ہے۔

''میڈیا کے ماہرین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ حکومتوں کی خارجہ پالیسی کے اجزائے ترکیبی میں ذرائع ابلاغ کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے،اس کے علاوہ جو عناصر خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ان میں تاریخی پس منظر، جغرافیائی محل وقوع، آبادی، اقتصادی اور فوجی قوت کے ساتھ ساتھ نظریاتی عوامل وتحریکات شامل ہوتے ہیں۔''۱۳

اس بات کو اور بہتر انداز میں سمجھنے کے لئے میں محمد عتیق صدیقی کی کتاب سے یہ اقتباس رقم کررہا ہوں۔ جوانہوں نے صحافت کے متعلق لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

''فرانسیسی مورخ گارساں دتاسی لکھتا ہے۔ان منحوس کارتوسوں کی تقسیم کے موقع پر ہندوستانی اخبارات نے جو

بد دلی پھیلانے میں پہلے ہی بڑی مستعدی دکھا رہے تھے۔ اپنی غیر محدود آزادی سے فائدہ اٹھایا اور اہل ہند کو کارتوس کو ہاتھ لگانے سے انکار کرنے پر آمادہ کیا اور یہ باور کرایا کہ اس حیلے سے انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔''۱۴

ان اقتباسات سے صاف طور سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی انقلاب یا جنگ کے حالات پیدا ہوئے وہاں صحافت نے نمایاں اور اہم کردار ادا کیا چاہے وہ پہلی جنگ عظیم ہو یا ہندوستان کی تحریک آزادی۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر صحافت نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اگر آج کے دور کی بات کریں تو صحافت اب ہماری زندگی کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ ہمیں صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلے اخبار یاد آتا ہے اس کے بعد دوسری ضروریات۔ آج صحافت کا پیشہ بھی اہم اور معزز پیشوں میں شمار کیا جاتا ہے اور صحافی کو کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ صحافت ایک عظیم مشن ہے اور اس مشن میں غیر جانبدار ہو کر ہی بہتر طور پر کام کیا جا سکتا ہے اور اس مشن کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

☆ صحافت کی تاریخ

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ انسان اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ یہ زمانہ قدیم سے ہی اس کی ضرورت رہے ہیں۔ انسانی تخیل کی پرواز کی کوئی حد نہیں۔ انسان جیسا سوچتا ہے جیسا محسوس کرتا ہے اور اپنی تحقیقی حس کی وجہ سے اُسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہی کوشش نئی ایجاد و نئی ٹیکنالوجی کی وجہ بنتی ہے۔ ترسیل و ابلاغ بھی انسانی جبلت میں شامل ہیں اور اسکی شروعات اشاروں کنایوں سے ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے اس ترسیل میں آوازیں شامل ہوگئیں۔ الفاظ کی تخلیق ہوئی اور نئی نئی زبانوں کی شروعات ہوئی۔ پھر انسان کی سوچ نے آواز اور خیالات کو ایک مستقل روپ دینے کی کوشش کی اور تصویروں کا دور شروع ہوا۔ تقریباً چھ ہزار سال پہلے دجلہ وفرات کی سرزمین سے تصویری رسم الخط کا آغاز ہوا۔ کئی برسوں تک اس میں کچھ خاص تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ بعد میں آوازوں کے بنیادی عناصر کو حروف کی شکل میں ڈھال دیا گیا۔ یونانیوں نے حروف کو ایک شکل دے کر ایک علامت دے کر لکھنے پڑھنے کے کام میں آسانی پیدا کر دی

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پرانا رسم الخط چینی زبان کا ہے اور سب سے پہلے کاغذ کی ایجاد بھی چین میں ہی ہوئی تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد شاہد حسین نے لکھا ہے۔

> ''چین کی تہذیب بھی تحریر کے سلسلے میں پوری دنیا میں نمایاں مقام رکھتی ہے گو کہ وہاں دستیاب ہونے والی سب سے قدیم کتاب کا زمانہ ۲۱۳ ق م بتایا جاتا ہے جو ریشم پر تحریر ہے۔ مگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ چین میں تحریر کا وجود ۳۰۰۰ ق م سے ہی تھا.................کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چین نے ۱۰۴ء میں کاغذ تیار کر لیا تھا۔ چین نے سات سو سال تک اس ایجاد کو دنیا کی نظروں سے چھپائے رکھا پھر بھی کچھ ترکستانی علاقے میں چینیوں سے یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔''۱۵

اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ سب سے پہلا چھاپہ خانہ چین میں ایجاد ہوا اور وہاں سب سے پہلے ایک کتاب ۸۶۸ء میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی کتاب داستان صحافت میں لکھتے ہیں۔

> ''چین کے صوبہ کانسو میں دنیا کی قدیم ترین کتاب دریافت ہوئی۔ اس میں لکھا تھا کہ اس کتاب کو وانگ چی لائے نے ۱۱ مئی ۸۶۸ء کو مفت تقسیم کرنے کے لئے چھاپا تھا تاکہ اس کے والدین کی یاد کو دوام حاصل ہو۔''۱۶

چین میں تانگ خاندان حکمراں تھا۔ اس کے ماتحت ایک گزٹ ٹی پاؤ ''محل کی خبروں'' کے نام سے جاری ہوا۔ یہ

اخبار دنیا کا سب سے پہلا مطبوعہ اخبار تھا۔لیکن کچھ لوگ چین سے ہی نکلنے والے ’پیکنگ گزٹ‘ کو پہلا اخبار بتاتے ہیں۔’’اس بارے میں مارکو پولو نے بھی اپنے سفر میں ۲۹۵ء میں تذکرہ کیا ہے۔‘‘ ۱۷

مغربی ممالک میں پرنٹنگ سے روشناس کرانے کا سہرا ایک جرمن John Gutenberg جوہان گوٹین برگ کے سر جاتا ہے۔ جرمنی میں چھپائی کا کام دوسرے مغربی ممالک سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔اور جرمنی سے ہی سب سے پہلا مطبوعہ اخبار شروع ہوا۔

> ’’پہلا مطبوعہ خبر نامہ ۱۶۰۹ء میں جرمنی میں جاری کیا گیا اس کا نام تھا Avisa Relation oderziting۔اور پھر دو سال بعد اسی طرح کا ایک چھپا ہوا خبر نامہ انگلستان میں پہلے پہل ۱۶۱۱ء میں نیوز فرام اسپین کے نام سے شائع ہوا۔‘‘ ۱۸

لندن میں چھپائی کا کام سب سے پہلے ۱۴۸۷ء میں شروع ہوتا ہے اور اس سے متعارف کروانے میں ولیم کیکسٹن (William Caxton) کا ہاتھ ہے۔جیسا کہ جوزف آر ڈومینک لکھتے ہیں۔

> "William Caxton, introduced the printing press into Great Britain in 1487 and established a profitable London printing company that published the leading books of the day ."19

یورپ کی تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ وہاں ایک حویلی سے دوسری حویلی اور ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک خبریں لے جانے والے گشتی درویش تھے، جو مستقل طور پر یہاں سے وہاں نئی معلومات کی ترسیل کرتے تھے۔اور بادشاہ سے انعام واکرام حاصل کرتے تھے۔جیسا کہ محمد عتیق صدیقی اپنی کتاب ’’ہندوستانی اخبار نویسی‘‘ میں لکھتے ہیں۔حضرت مسیح سے کوئی ۱۵۷ برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبر نامہ جاری کیا جاتا تھا جس میں سرکاری اطلاعیں نیز میدان جنگ کی خبریں بھی ہوتی تھیں۔

پرنٹنگ مشین کے ایجاد ہونے کے بعد ۱۵۳۰ء میں Henry VIII نے ایک منظور نامہ بنایا جو بعد میں اخبارات کی شکل میں سامنے آیا۔۱۶۰۰ء تک لندن میں چھاپہ خانوں کی ایک بڑی تعداد ہو چکی تھی۔اوران کے شائع شدہ مواد حکومت سے منظور شدہ ہوتے تھے۔۱۶۲۲ء میں اس سلسلے میں اور پیش رفت ہوئی۔اور ایک انجمن کی تشکیل دی گئی جس کے تحت ایک کتابچہ شائع ہوا جسے پڑھنے میں لوگ دلچسپی لینے لگے اور یہ کتابچہ بعد میں ایک اخبار کی شکل لے لیتا ہے۔

> ’’سولہویں صدی کے خبر ناموں کی یا سترہویں صدی کے اخباروں کی وہ سج دھج نہیں ہوتی تھی جو آج ہمارے اخباروں کی ہوتی ہے وہ تو بس سیدھے سادھے خبر نامے ہوتے تھے۔سترہویں صدی میں کچھ لوگوں نے نجی طور پر خبر رسانی کا کام یورپ میں شروع کیا۔ملکہ الزابتھ کے عہد میں جس کا انگلستان میں وہی زمانہ تھا جو ہندوستان میں اکبر کا تھا۔اخبار نویس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور اخباروں کی آزادی کے حق کو ۱۶۴۱ء میں قانوناً تسلیم کیا گیا۔‘‘ ۲۰

اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے سید اقبال قادری لکھتے ہیں۔

> ’’برطانوی اخبار نویسی اور سیاسی تاریخ کا یہ ایسا اہم ترین واقعہ تھا جس کے بعد ہی انگریزی خبر ناموں نے ترقی کر کے اخبار کی شکل اختیار کی اور ۱۷۰۲ء میں لندن کا پہلا روزانہ اخبار ’لندن ڈیلی کورانٹ‘ شائع ہوا۔‘‘ ۲۱

اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی مضامین بھی ہوتے تھے جو کہ تاجروں کے لئے فائدہ مند تھے۔دھیرے دھیرے صحافت نے ایک پیشے کا روپ لے لیا اور حکمراں وقت کے خلاف لکھا جانے لگا۔جس کی وجہ سے اخبار

کے مالکان پر ٹیکس کا زیادہ بوجھ بڑھا دیا گیا۔

امریکہ میں سب سے پہلے Benjamin Haris نے ۱۶۸۶ء میں پمفلٹ وغیرہ شائع کرنے شروع کئے ۔ چار سال بعد پہلا امریکی اخبار منظر عام پر آیا۔۲۲ جس کا نام پبلک اوکرانس (Public Occurances) تھا۔اس میں حکومت کے خلاف بیان بازی ہوتی تھی ۔ یہ اخبار پہلے ہی Issue کے بعد بند ہو گیا تھا ۔ پھر ۱۷۰۴ء میں John Compbell نے بوسٹن نیوز لیٹر کی شروعات کی جس میں دوسرے اخباروں کا مواد ہوتا تھا اور خبریں بھی کافی پرانی ہوتی تھیں بعد میں اس کا نام بوسٹن گزٹ کر دیا گیا۔اس کے بعد تو پھر جیسے اخبارات کی باڑھ سی آ گئی اور اخبارات نے لوگوں پر کافی پکڑ مضبوط کر لی۔

☆ ہندوستانی صحافت

جیسے جیسے تہذیب وتمدن کی ترقی ہوتی گئی ویسے ہی ویسے انسان ضروری اشیا کی ایجادات کرتا گیا۔ ہندوستان میں بھی خبروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لئے اخبارات کا سہارا لیا گیا اور پہلے پہل یہاں بھی پرانے طریقے رائج تھے۔ڈھول پیٹ کر سرکاری فرمان سنائے جاتے تھے اور لوگوں کو بہت سی باتوں کا پتہ چل جاتا تھا۔اس کے علاوہ پتھروں پر سرکاری احکامات کندہ کرائے جاتے تھے۔آج بھی ان کے نشانات مل جاتے ہیں۔اس بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

> ''پرانے زمانے کے کتبے اور ستون......خبر رسانی کی ابتدائی تاریخ کی گمشدہ کڑیاں ہیں۔اس زمانے میں ستونوں اور چٹانوں پر عبارتیں کندہ کر کے سرکاری قوانین ، مذہبی احکام اور اخلاقی اصول لوگوں تک پہنچائے جاتے تھے۔اسی طرح کا ایک قدیم ترین سنگی کتبہ قدس (بیت المقدس) کے جنوب مشرقی سرے کی ایک پہاڑی پر ملا ہے۔اس کی زبان انجیلی عبرانی ہے اور ہر کتبہ کم وبیش سات سو سال قبل مسیح کا ہے۔'' ۲۳

قدیم دور میں انہیں کتبوں اور ڈھول وغیرہ کے ذریعہ لوگوں تک خبریں پہنچائی جاتی تھیں ۔ ملک کا حکمراں بھی اپنے کچھ جاسوس رکھتا تھا جن کا کام یہ تھا کہ وہ عوام کے حالات اس تک پہنچائے ۔اس بارے میں جے نٹراجن لکھتے ہیں ۔

> ''شہنشاہ کو حاصل ہونے والی خبریں دو طرح کی ہوتی تھیں۔مختلف جاسوسوں سے حاصل ہونے والی خبریں جنہیں وہ خود حاصل کرتا تھا۔ یہ جاسوس پولس کی خفیہ شاخ کے اہم افراد ہوتے تھے۔دوسری طرح کی خبریں شہنشاہ کو روزانہ عوام کے معاملوں کو سلجھانے ، وزراء سے بات چیت کرنے اور دوسرے حکمرانوں سے خط وکتابت کے دوران حاصل ہوتی تھیں۔شہنشاہ کا کافی وقت انہیں کاموں میں گزرتا تھا۔'' ۲۴

مغلوں کے عہد میں رپورٹ لکھنے والوں کو بحال کیا جاتا تھا۔ان کا کام یہ تھا کہ مختلف اعلیٰ محکمے کو وہ رپورٹ بنا کر بھیجتے تھے۔ یہ رپورٹ ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں ۔ یہ رپورٹیں اعلیٰ حکام کو عوام کے متعلق جانکاری دینے کے خیال سے بھیجی جاتی تھیں۔اس بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

> ''ہندوستانی بادشاہوں نے خبر رسانی کی اہمیت کو اس حد تک محسوس کر لیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک اخبار نویس ضرور مقرر کیا جاتا تھا۔جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے حالات سے بادشاہ اور اس کے وزیروں کو بے کم وکاست اطلاع دیا کرے۔'' ۲۵

مغلوں کے عہد میں اس طرح کی رپورٹیں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ان رپورٹ لکھنے والوں سے ہی اخبار نویسی کے فن کو عروج حاصل ہوا اور مغل بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں اخباروں کی بھی کافی تعداد ہو گئی تھی۔

> ''مغلوں کے عروج کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی کے فن نے بھی عہد بہ عہد ترقی کی ۔ چنانچہ اورنگ زیب

کے عہد میں اخبار نویسوں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی تاریخوں میں اخبار نویس اور واقعہ نویس وغیرہ کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔''۲۶

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں بھی اس طرح کے اخبار نویس ہوتے تھے۔شروع شروع میں انگریزوں اور کمپنی سے متعلق کام کے لئے اخبار نویس مقرر کئے جاتے تھے۔لیکن بعد میں ان کا دائرہ وسیع کر دیا گیا۔ کمپنی کے ملازمین کو ان اخبارنویسوں سے کافی فائدہ پہنچتا تھا۔ وہ اپنی شکایات کو اس کے ذریعہ اعلیٰ حکام تک پہنچاتے تھے اور اس طرح بھی فن اخبار نویسی کو کافی ترقی حاصل ہوگئی۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اپنی شکایتوں کی دادرسی کے لئے بھی وقائع نویس کا سہارا لیا کرتے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں نے خبر رسانی اور اخبارنویسی کی اہمیت کو بدرجہ اتم محسوس کر لیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں خبر رسانی کے فن نے جو ترقی کی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اندرون ملک میں خبریں اور بازار بھاؤ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کا ایک سیدھا سادہ اور تیز رو نظام قائم ہو گیا تھا۔''۲۷

سولہویں صدی کی شروعات ہندوستان میں کمپنی کا عہد لے کر آئی اور کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ مل گیا۔اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بازاروں پر قبضہ کرنے کے ساتھ پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ کمپنی کے کچھ ملازمین ایسے بھی تھے جو کمپنی کی پالیسیوں سے مطمئن نہیں تھے۔انہیں اس کا معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ایسے ہی کچھ لوگوں میں ایک مسٹر ولیم بولٹس (Mr. William Bolts) تھے۔ان کے بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

''ان کا نام ہمارے لئے یوں بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں پہلا مطبوعہ اخبار جاری کرنے کی کوشش کی۔اگرچہ قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ان کی کوشش نامشکور رہی۔''۲۸

''یہی مسٹر بولٹس ہی وہ شخص تھے جنہوں نے اپنے اخبار کے لئے یہ اشتہار دیا تھا کہ جو شخص بھی عام ملکی مسائل اور عوامی معاملات کے بارے میں خبر پڑھنا چاہے وہ ان کے گھر آ کر پڑھ سکتا ہے۔''۲۹

اس اشتہار کے نکالنے کی وجہ سے مسٹر بولٹس کو سزا کا حقدار ٹھہرایا گیا اور انہیں کلکتہ سے شہر بدر کر کے مدراس بھیج دیا گیا۔ کمپنی نے انہیں حکم دے دیا کہ وہ جلد سے جلد مدراس جائیں اور وہاں سے یوروپ روانہ ہو جائیں۔مسٹر بولٹس کو اخبار نکالنے کی اپنی کوشش کی پاداش میں کافی پریشانی اٹھانی پڑی لیکن انہوں نے بھی ٹھان لیا تھا کہ وہ کمپنی کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے لا کر رہیں گے۔اور آخرکار ہندوستان سے واپس یوروپ جا کر انہوں نے کمپنی کے کرتوتوں کو ایک کتابی شکل دے دی۔

''ہندوستان سے واپس جانے کے بعد مسٹر بولٹس نے ایک کتاب 'Consideration on Indian Affairs' کے نام سے لکھی......یہ کتاب جو پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے نایاب تو نہیں ہے لیکن کمیاب ضرور ہے۔کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ جو ڈھائی سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ اور اس کے ان ہتھکنڈوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جو اس نے ہندوستانی حکمرانوں اور دیسی کاریگروں کے ساتھ استعمال کئے۔کتاب کے دوسرے حصے میں وہ تمام معاہدات درج کئے گئے ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۷۱ء تک ہندوستانی حکمرانوں سے وقتاً فوقتاً کئے تھے۔''۳۰

مسٹر بولٹس کے حالات کو دیکھتے ہوئے بارہ سالوں تک کسی نے بھی کوئی اخبار نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ پورے بارہ سالوں کے بعد ایک دوسرے انگریز جیمز اگسٹس ہکی نے 'ہکیز بنگال گزٹ' یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائز کے نام سے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ہندوستان کا پہلا انگریزی اخبار جاری کیا۔یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔اخبار کے پہلے شمارے میں انہوں نے اپنے بارے میں لکھا تھا کہ:

''اخبار چھاپنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے اور نہ میری طبیعت کو اس کام سے لگاؤ ہی ہے۔ میری پرورش بھی اس طرح کی نہیں ہوئی ہے کہ میں محنت ومشقت کی غلامانہ زندگی کا عادی بن سکوں۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود روح ودماغ کی آزادی خریدنے کے لئے میں اپنے جسم کو بخوشی غلام بنا رہا ہوں۔''۳۱

''جیمز اگسٹس ہکی خود کو کمپنی کا پہلا پبلشر کہتے تھے۔اس اخبار کی اہم اور خاص بات یہ تھی کہ اس میں کمپنی کے ملازمین اور خود گورنر جنرل وارن ہسٹنگس کی پرائیوٹ لائف پر کافی کچھ تنقید کی جاتی تھی۔اور اسی تنقید کی وجہ سے اُنہیں اپنے اخبار کو زیادہ شائع کرنے سے منع کر دیا گیا۔لیکن اس کے باوجود ہکی نہیں مانے اور اپنے اخبار میں کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں پر تنقید کرتے ہی رہے تو انہیں جیل بھی جانا پڑا۔جیل سے باہر آنے کے بعد بھی جب وہ نہیں مانے تو ۱۷۸۲ء میں ان کے پریس کو ضبط کر لیا گیا۔ہکی کے بعد پھر میسرز بی میسنک اور پیٹر ریڈ نے انڈیا گزٹ شائع کرنا شروع کیا۔

''یہ اخبار بھی ہفت روزہ تھا اور اسے حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔''۳۲

۴ مارچ ۱۷۸۴ء سے کلکتہ گزٹ شائع ہونا شروع ہوا۔اس کے ایڈیٹر فرانسس گلیڈون تھے جو انگریزی اور فارسی پر کافی عبور رکھتے تھے۔وہ کافی کتابوں کے بھی خالق تھے۔اس اخبار کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک کالم فارسی میں بھی ہوتا تھا۔

''کلکتہ گزٹ کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس اخبار کے ابتدائی نمبروں میں ایک کالم فارسی زبان کا بھی ہوتا تھا۔اور خلاصہ اخبار دربار معلیٰ یہ دارالخلافت شاہ جہاں آباد اس کالم کی مستقل سرخی ہوا کرتی تھی۔''۳۳

اسی درمیان کلکتہ سے ۱۷۸۶ء میں ایک اور اخبار 'کلکتہ کرانیکل' نکلنا شروع ہوا۔ مدراس سے ۱۲، اکتوبر ۱۷۸۵ء کو مدراس کوریئر کے نام سے پہلا اخبار نکلنا شروع ہوا۔اس کے بعد پھر ۱۷۹۱ء میں مدراس کوریئر کے اس وقت کے مدیر ہیوج بوئیڈ (Huge Boyd) نے استعفیٰ دے کر اپنا نیا اخبار ہرکارو شروع کیا۔

''اس کے شروع ہونے کا سال محمد عتیق صدیقی ۱۷۹۳ء بتاتے ہیں جب کہ جے کے نٹراجن نے ۱۷۹۱ بتایا ہے۔''۳۴

بعد میں پھر Boyd کی موت ہو جانے سے اخبار شائع ہونا بند ہو جاتا ہے۔۱۷۹۵ء میں آر ولیمس نے مدراس گزٹ کی شروعات کی۔اس کے بعد پھر ہمفری نے 'انڈیا ہیرالڈ' شروع کیا۔

بمبئی کا پہلا اخبار 'بمبئی ہیرالڈ' تھا، جو ۱۷۸۹ء میں شروع ہوا اس کے بعد پھر کوریئر نامی اخبار شروع ہوا اس اخبار میں گجراتی اشتہارات بھی شائع ہوتے تھے۔

''۲۰ جون ۱۷۹۰ء کو بمبئی گزٹ کی شروعات ہوئی اس میں تجارتی اور قومی وبین الاقوامی خبریں ہوتی تھیں۔بمبئی کا چوتھا انگریزی ہفت روزہ اخبار 'آبزرور' تھا جو ۱۷۹۱ء میں شروع ہوا۔''۳۵

۱۸ویں صدی کے اواخر تک کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے علاوہ دوسرے بڑے شہروں سے بھی اخبارات نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ان اخبارات میں خبروں کے علاوہ تفریحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔اس وقت کی اخباری صحافت پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہی بات نظر آتی ہے کہ ہندوستان میں یہ اخبار انگریزوں کے لئے ہی نکالنے جا رہے تھے تو خبریں بھی انہیں کے تعلق سے دی جاتی تھیں اور ان سے فائدہ بھی وہی اٹھاتے تھے۔

''اخبارات میں سرکاری رپورٹوں کے علاوہ برٹش باشندوں کی دلچسپی، انگلینڈ کے حالات، فوج اور ہندوستانی حکمرانوں کی پالیسیوں سے جڑے موضوع پر اداریے ہوتے تھے۔اس طرح کی خبروں کے علاوہ ہمیں پیرس، اسٹاک ہوم، ویانا، میڈرڈ، چین، ریوڈے جنزیو اور دوسرے مقامات سے رپورٹ حاصل ہوتی ہیں۔مدیر کے نام مکتوب، سرکاری احکام،

سماجی فائدے کی باتیں، شعروشاعری، اشتہارات اور یہاں تک کہ فیشن کے تعلق سے بھی خبریں ہوتی ہیں۔''۳۶

دیسی اخبارات کی شروعات ہندوستان میں انیسویں صدی کے دوسرے دہے میں ہوتی ہے جب بنگال سے ہی پہلا اخبار شائع ہوا۔ پہلا اخبار بنگلہ زبان میں گنگا دھر بھٹا چاریہ نے ۱۸۱۶ء میں 'بنگال گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔ اس اخبار کے بعد ۱۸۱۸ء میں سی رام پور کی مشنری نے 'ڈگ درشن' کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ یہ ماہوار رسالہ بعد میں ہفت روزہ میں تبدیل ہوگیا اور اس کا نام 'سماچار درپن' کردیا گیا۔ ۱۸۲۹ء میں یہ اخبار ہفتے میں دوبار نکلنے لگا۔ اس کی خبریں قومی اور بین الاقوامی دونوں ہوتی تھیں۔

''اس میں مقامی اور بین الاقوامی دونوں طرح کی خبریں بنگلہ اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کی جاتی تھیں۔''۳۷

اس وقت کے دیسی اخبارات بھی انگریزوں اور انگریزی کے بغیر نہیں شائع ہوتے تھے۔ ان اخباروں میں انگریزوں کے متعلق اور ان کے فائدے کی خبروں کو زیادہ جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن وہ بنگلہ زبان میں ہوتی تھیں۔ اور ساتھ ہی انگریزی میں بھی خبریں دی جاتی تھیں۔ سماچار درپن کافی لمبے عرصے تک شائع ہوتا رہا۔ سماچار درپن کے بعد رام موہن رائے نے ہندوستانی صحافت پر کافی گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں ایک مکمل دیسی یا ہندوستانی اخبار نکالنے کا سہرا رام موہن رائے کے سر ہی جاتا ہے۔ انہوں نے ہی پہلا بنگلہ اور پہلا فارسی اخبار نکالا۔ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

''رام موہن رائے کے بنگلہ اخبار سمبد کمودی اور فارسی اخبار مراۃ الاخبار نے ہندوستانی اخبار نویسی کا سنگ بنیاد رکھا اور ان اخباروں نے اعلیٰ مدارج حاصل کئے۔ سمبد کمودی اور مراۃ الاخبار کے علاوہ اور بھی متعدد دیسی اور انگریزی اخباروں کو ان کی ذات سے بالواسطہ تعلق رہا ہے۔ ابتدائی دور کی ہندوستانی اخبار نویسی میں رام موہن رائے کو جو اعلیٰ مقام حاصل تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے مخالف اخبارات بھی ان کے مضامین شائع کرنا باعث فخر سمجھتے تھے۔''۳۸

رام موہن رائے نے دسمبر ۱۸۲۱ء میں بنگلہ زبان میں ہفت روزہ 'اخبار سمبد کمودی' شروع کیا۔ اس اخبار میں سیاسی خبریں ملکی اور غیر ملکی واقعات اور مقامی خبروں کو جگہ دی جاتی تھی۔ یہ اخبار منگل کے روز شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار ۳۳ سال تک شائع ہوتا رہا۔

رام موہن رائے نے صحافت کا پورا حق ادا کیا اور صحافت کو ایک مشن، ایک تحریک کی شکل میں استعمال کیا۔ رام موہن رائے نے اپنے اخبار کے ذریعہ ستی کی رسم کے خلاف آواز بلند کی اور آخر کار ۱۸۲۹ء میں ستی کی رسم پر لارڈ بینٹک نے روک لگادی۔

رام موہن رائے کے اخبار کے جواب میں 'سماچار چندریکا' شروع ہوا۔ اس اخبار کو بابو بھوانی چرن بنرجی نے شروع کیا تھا۔ یہ اخبار رام موہن رائے کے عقیدے کی مخالفت کررہا تھا اور ستی کی رسم کو جاری رکھنے کے حق میں تھا۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بھوانی چرن پہلے دیسی اخبار سمبد کمودی کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق:

''اخبار سماچار چندریکا کو شائع کرنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے ۱۱/اپریل ۱۸۲۱ء کو بھوانی چرن بنرجی نے درخواست دی۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ وہی بابو بھوانی چرن بنرجی تھے جو رام موہن رائے کے اخبار سمبد کمودی کے پہلے ایڈیٹر تھے۔''۳۹

رام موہن رائے نے ہی ۲۰/اپریل ۱۸۲۲ء کو فارسی کا پہلا اخبار مراۃ الاخبار کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعد پھر برہم نی کل میگزین کے نام سے رام موہن رائے نے انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں

رسالہ شروع کیا تھا۔

اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما تھا جو مارچ ۱۸۲۲ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ فارسی کا دوسرا اخبار جام جہاں نما تھا جو مئی ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے نکلنا شروع ہوا۔ پہلا گجراتی اخبار بھی ۱۸۲۲ء میں ہی نکلنا شروع ہوا۔ یہ اخبار بمبئی سے شروع کیا گیا تھا۔ اس کا نام 'بمبئی سماچار' تھا اور یہ ہفت روزہ تھا۔ بعد میں یہ اخبار روزنامے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہندی کا پہلا اخبار اودنت مارتنڈ تھا۔ اس اخبار کا اجراء ۳۱ رمئی ۱۸۲۶ء کو کیا گیا تھا۔ یہ اخبار کلکتہ سے نکلتا تھا۔ فارسی اخبارات میں 'مراۃ الاخبار' اور 'جام جہاں نما' کے بعد 'شمس الاخبار' اور اخبار 'سی رام پور' کا نام لیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ، فارسی، ہندوی اردو اور گجراتی کے اخبارات نے ۱۸۵۷ء تک کافی ترقی کر لی تھی اور ہندوستان کی سیاست پر گہرے نقوش مرتب کرنا شروع کر دیے تھے۔ تمل زبان میں پہلا رسالہ 'تمل میگزین' کے نام سے ۱۸۳۱ء میں شروع ہوا تھا۔ ملیالم زبان میں پہلا اخبار 'وگنین نچھپین' کے نام سے ۱۸۴۰ء میں شروع ہوا تھا۔ ان زبانوں کے اخبارات کے علاوہ دوسری زبانوں، پنجابی، اڑیا اور آسامی میں کافی عرصے کے بعد اخبار نویسی کی شروعات ہوئی۔

☆ اردو صحافت : ایک تاریخی جائزہ

اردو صحافت کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں میں اردو اخبار کی شروعات کے سلسلے میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو کافی دنوں تک مولوی محمد باقر کے اخبار کو پہلا اخبار تسلیم کیا گیا۔ لیکن بعد کی تحقیقات سے ظاہر ہو گیا کہ سب سے پہلا اخبار 'جام جہاں نما' تھا جو کلکتے سے شروع کیا گیا تھا۔ 'جام جہاں نما' کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ مرزا پوری تھے اور اخبار کے مالک ہری ہر دت بنگو تھے۔

اس اخبار کی تاریخ اشاعت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق اخبار جام جہاں نما مئی ۱۸۲۲ء سے شروع ہوا تھا۔ یہ تاریخ انہوں نے فارسی جام جہاں نما کے لئے لکھی ہے۔ جب کہ اردو جام جہاں نما کی تاریخ کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

> ''فارسی جام جہاں نما کا اجراء مئی ۱۸۲۲ء میں ہوا۔ اس کے دوسرے ہی سال باہمت ایڈیٹر نے اردو ضمیمہ بھی نکالنا شروع کر دیا۔ دونوں جام جہاں نما کے نمبروں کے تفاوت سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیشنل آرکائیوز میں فارسی جام جہاں نما کی بھی کچھ فائلیں محفوظ ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اردو کے پہلے ۸۰ نمبر نہیں ہیں۔ پہلا نمبر جو ہمیں وہاں ملتا ہے۔ وہ اردو زبان میں نمبر ۸۱ تاریخ ماہ دسمبر ۱۸۲۴ء عیسوی کا ہے۔ اب اگر حساب لگایا جائے تو اردو کا پہلا نمبر مئی ۱۸۲۳ء میں شائع ہوا ہوگا۔ اردو 'جام جہاں نما' کا سائز بھی فارسی جام جہاں نما کی طرح 20x30/8 ہوا کرتا تھا اور ضخامت صرف چار صفحات ہوتی تھی۔''[۴۰]

جب کہ مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب ''روح صحافت'' میں جام جہاں نما کی تاریخ آغاز ۱۶ رمئی ۱۸۲۲ء لکھی ہے۔

> ''اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما کلکتہ سے ۱۶ رمئی ۱۸۲۲ء کو جاری ہوا۔ جس کا کچھ عرصوں تک دو تہائی حصہ فارسی میں اور ایک تہائی اردو میں نکلا۔''[۴۱]

تاریخ صحافت پر ایک اہم تحقیقی کام ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کیا ہے اور انہوں نے اخبار کی تاریخ اجراء ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء بتائی ہے۔ عبدالسلام خورشید کی یہ رائے کافی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ خورشید صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود 'کلکتہ منتھلی جرنل' کی ۱۸۲۲ء کی فائلوں کے حوالے سے بتایا ہے۔

> ''جہاں گیس ہمارے بازاروں اور چھاپے خانوں کو روشن کرتی ہے۔ وہاں ہمارے یہاں دیسی فلسفی بھی موجود

ہیں جو ہمارے دماغوں کو منور کرتے ہیں ایک سنگ باد کو مدعی کے آسمانی نام سے مشہور ہے اور دوسرا اپنے آپ کو سماچار چندریکا کے نام سے یاد کرتا ہے اور ہمارے علم کے مطابق یہ بھی آسمانی نام ہے۔ اب پچھلے دنوں ایک تیسرا فلسفی نمودار ہوا ہے۔ جس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ ہمارا ہم عصر اخبار 'جان بل' گزشتہ جمعے کے شمارے میں ان تینوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا لیکن اسکا رشتہ کس سے ہے، اسے کس نے جاری کیا۔ اس کے بارے میں ہمیں کوئی بھی کچھ بتا نہیں سکتا نہ اس کا کوئی پراسپکٹس ہے نہ اس پر چھاپنے والے کا نام درج ہے۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین ورق پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے دن ۲۷/ مارچ کو شائع ہوا۔''۴۲؎

نادر علی خاں نے بھی عبدالسلام خورشید کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

''جام جہاں نما کا موجودہ شمارہ جس پر نمبر ۱۳۳ درج ہے ۲۹/ دسمبر ۱۸۲۴ء بروز چہار شنبہ کو شائع کیا گیا تھا اور مذکورہ بالا بیان کے مطابق اس کا آغاز بھی اسی دن ہوا تھا۔ اس لئے موجودہ شواہد کی روشنی میں تاریخ اجراء ۱۸۲۲ء کو تسلیم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔''۴۳؎

محققین جام جہاں نما کے تاریخی اجراء کے سلسلے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی تحقیق سے جو ثبوت پیش کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ اخبار کے اجراء کی تاریخ ۲۷/ مارچ ۱۸۲۲ء ہی کو صحیح مانا جا سکتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی نے فارسی جام جہاں نما کو پہلا اخبار قرار دیا ہے اور اردو جام جہاں نما کو فارسی جام جہاں نما کا ضمیمہ بتایا ہے۔ دوسری طرف عبدالسلام خورشید نے جام جہاں نما کی اولیت ثابت کرنے کے لئے اُس وقت کے دو اہم اخباروں کلکتہ منتھلی جرنل اور جان بل کے حوالے دئے ہیں۔ عبدالسلام خورشید کے مطابق جام جہاں نما پہلے اردو میں شائع ہونا شروع ہوا اور بعد میں فارسی میں شروع ہوا۔ اردو جام جہاں نما کے چھ شمارے شائع ہونے کے بعد کلکتہ منتھلی جرنل میں ایک اعلان شائع ہوا تھا کہ جو اخبار ہندوستانی میں نکلتا تھا اسکی زبان میں تبدیلی ہونے والی ہے۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد یہ اخبار فارسی زبان میں شائع ہونے لگا۔ بقول نادر علی خان:

''ابتداً جام جہاں نما صرف اردو میں ہی شائع ہوتا تھا اور بقول جان بل اخبار مذکور میں مالک و مدیر اور طابع کے اسمائے گرامی درج نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ شمارہ نمبر کا بھی اہتمام نہیں تھا۔ آٹھویں شمارے (مورخہ ۱۵/ مئی ۱۸۲۲ء بروز بدھ) سے فارسی کا ایک کالم شروع کیا گیا جو اس درجہ مقبول ہوا کہ دو شماروں کے بعد اردو کے بجائے فارسی ہی میں شائع ہونے لگا۔ اور اسی اشاعت کے ساتھ شمارہ نمبر کا بھی اضافہ ہوگیا اور اس طرح گویا ۲۹/ مئی ۱۸۲۲ء سے فارسی کے دور کا آغاز ہوا۔''۴۴؎

ایک سال کے بعد ہی فارسی جام جہاں نما نے پھر اردو کی چاشنی اپنائی۔ اور فارسی زبان کو برقرار رکھتے ہوئے اردو کا ضمیمہ شروع کیا۔ اس بارے میں نادر علی خاں نے لکھا ہے۔

''منشی سدا سکھ مرزا پوری نے ایک سال بعد پھر اردو اخبار کی تجدید کی، لیکن یہ رجعت ہندوستانی اہل ذوق کی طلب پر نہیں بلکہ یوروپین تجار اور اہل علم کی دفتری اور علمی ضرورت کے پیش نظر کی گئی تھی۔ چنانچہ ہر شمارے کے سرورق پر انگریزی میں اخبار کے تغیر، نوعیت اور قیمت کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ مدیرِ 'جام جہاں نما' نہایت ادب کے ساتھ یہ امر عوام کے گوش گزار کرتا ہے کہ اخبار کے حلقہ معاونین کے یوروپی طبقے کے لئے اخبار کو زیادہ دلچسپ، پرلطف اور مفید بنانے کی غرض سے اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اس اخبار کا ایک

ضمیمہ خالص ہندوستانی یا اردو زبان میں شائع کرے اگر اسے فارسی اخبار کے ساتھ خریدا جائے تو اس کا چندہ
چار آنے فی پرچہ یا ایک روپیہ ماہانہ ہوگا۔لیکن اگر صرف اردو ضمیمہ خریدا جائے تو چندہ دو روپیہ ماہانہ ہوگا۔‘‘۴۵؎

اردو صحافت کی تاریخ مرتب کرنے والوں میں اس اختلاف رائے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جو ماخذ و مواد ایک محقق کو میسر تھے وہ دوسرے کو نہیں مل سکے۔محمد عتیق صدیقی نے نیشنل آرکائیوز کی فائلوں کے حوالے سے اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے،لیکن انہیں پنجاب یونیورسٹی کے فائل نہیں مل سکے۔پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے بھی کچھ پریشانیاں ہوئی ہیں کیونکہ صحافت کی تاریخ و تحقیق کے کئی بے حد اہم کام تقسیم کے بعد ہوئے ہیں۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کلکتہ جرنل کے حوالے سے اردو جام جہاں نما کو پہلا اخبار بتایا ہے۔یہ فائل پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔اہم بات یہ ہے کہ مولانا امداد صابری اور عتیق صدیقی کو یہ فائل تقسیم ملک کی وجہ سے نہیں مل سکے اور ان کے پاس اپنی تحقیق کے لئے نیشنل آرکائیوز کی دستاویزات یا مارگریٹا بارنس کے حوالے تھے۔حالانکہ پنجاب یونیورسٹی کے فائل اردو صحافت کی تاریخ مرتب کرنے میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ان کی تحقیق میں پنجاب یونیورسٹی کے فائل کا حوالہ نہیں ہے۔

اردو جام جہاں نما کے شروعاتی عہد میں خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور اخبار کا زیادہ تر حصہ خبروں پر مشتمل ہوتا تھا۔خبروں کے ساتھ ساتھ غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ظاہر ہے کہ اس وقت آج کی طرح خبر رساں ایجنسیاں یا نامہ نگار نہیں تھے اس لئے زیادہ تر خبریں انگریزی اخبار سے ترجمہ کر کے شائع کی جاتی تھیں۔خبروں کے انتخاب میں یہ خاص خیال رکھا جاتا تھا خبریں مقامی ہوں اور ہندستانی عوام کے متعلق ہوں۔اخبار کی پیشانی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا نشان شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کے بیشتر قاری انگریز تھے اس لئے انکی دلچسپی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔انگریزوں کی بڑی تعداد نے اس اخبار کو اردو سیکھنے کیلئے پڑھنا شروع کیا تھا۔خبروں کے لئے وہ انگریزی اخبار کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔اردو جام جہاں نما میں یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے خبریں شائع ہونا بند کردی گئیں اور تقریباً چار ماہ تک تاریخ انگلستان قسط وار شائع ہوتی رہی۔اس کے بعد ایک سال تک نپولین کی داستان اس اخبار کی زینت بنی۔اس کے علاوہ تاریخ عالمگیری کا ترجمہ بھی شائع ہوا۔نادر علی خاں لکھتے ہیں۔

’’چونکہ یوروپین اس اخبار کو اردو زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے خریدتے تھے اس لئے اس کی زبان سادہ،رواں اور عام فہم ہوتی تھی اور حتی الامکان ثقیل اور نامانوس الفاظ پیچیدہ اور متعلق تراکیب اور گنجلک عبارت سے گریز کیا جاتا تھا لیکن اخبار کی یہ ترتیب زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔کیونکہ اردو اخبار کے خریدار عموماً انگریز تھے جو براہ راست انگریزی اخبارات سے استفادہ کرتے تھے اس لئے یہ خبریں باسی کڑھی معلوم ہوتی تھیں۔چنانچہ یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے خبروں کا سلسلہ منقطع کر کے تاریخ انگلستان کی اشاعت شروع کی گئی اور چار ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔پھر تقریباً ایک سال تک محاربات نپولین کی روداد درج ہوتی رہی۔۱۷رجون ۱۸۲۷ء سے ۲۳رجون ۱۸۲۸ء تک تاریخ عالمگیری زینت اخبار بنتی رہی۔‘‘۴۶؎

تاریخ عالمگیری کا ترجمہ مکمل ہونے کے بعد اردو کے صفحات کو بند کردیا گیا۔یوں بھی اس وقت فارسی زبان کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور لوگ اردو کے مقابلے فارسی زبان ہی زیادہ پڑھتے تھے اور سمجھتے تھے۔اردو صحافت کے بند کرتے وقت ایڈیٹر نے اعلان کیا تھا۔

’’اس لحاظ سے کہ بہتیرے قدرشناس جنھوں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جنھوں کی زبان ہے وہ فارسی تحریر چاہتے ہیں خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتے سے ہندی فرمان کے عوض ایک فرمان اور بھی فارسی میں لکھا جائے۔‘‘۴۷؎

اردو کا یہ پہلا اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شروع ہوا تھا اور ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہوگیا۔کیوں کہ یہ اخبار کچھ مہینے

اردو میں نکلنے کے بعد فارسی میں نکلنے لگا تھا۔تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے چھ شمارے اردو میں شائع ہوئے تھے اور دوبارہ اردو میں جاری ہونے کی تاریخ مئی ۱۸۲۳ء ہے اس طرح یہ اخبار چار سال آٹھ مہینوں تک جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔اس اخبار کی درخواست ہری ہردت بنگو نے دی تھی۔اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال تھے اور پبلشر ولیم پیٹرس اینڈ کمپنی تھی۔اخبار کے ساتھ تجارت اور خط وکتابت وغیرہ کے لئے تاراچند کا نام دیا جاتا تھا۔یہ اخبار ہر بدھ کو کلکتہ کے ۱۱ر سرکلر روڈ سے شائع ہوتا تھا۔ اردو پرچے کے لئے ماہانہ ایک روپیہ اور فارسی پرچے کے لئے ماہانہ دو روپئے رقم دینی پڑتی تھی۔یہ اخبار کافی وقت تک انگریز حکومت کی ملکیت میں ہی رہا۔اخبار کا سائز 20x30/8 تھا اور اس میں دو کالم ہوتے تھے۔اخبار میں ایک بار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اخبار سے ناراض ہوگئی اور اخبار سے اپنا حق ملکیت الگ کرلیا۔

جام جہاں نما کے بعد اردو اخبارات کی تاریخ میں دوسرا بڑا نام 'دہلی اردو اخبار' کا ہے۔لیکن دہلی اردو اخبار سے پہلے بھی کچھ اردو اخبارات شائع ہوتے تھے۔ان اخبارات میں بمبئی سے آئینہ سکندری ۱۸۳۴ء تا ۱۸۵۵ء کا نام لیا جاسکتا ہے۔یہ فارسی اخبار تھا جس میں ۱۸۳۴ء سے اردو ضمیمہ بھی شروع کیا گیا۔بقول نادر علی خاں۔

> ''آئینہ سکندری فارسی اخبار تھا جو ۲۶ر اپریل ۱۸۲۲ء کو بمبئی سے جاری کیا گیا۔یہ اخبار 8x12 سائز کے بارہ صفحات پر ہفتہ وار پنج شنبہ کو فضل حق کی ادارت میں رامیس پریس بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔۱۸۳۳ء کے اواخر تک یہ صرف فارسی اخبار تھا مگر ۱۸۳۴ء میں اردو ضمیمہ کا بھی اضافہ کیا گیا۔''
>
> ۴۸

انگریزوں نے ملک کو فارسی زبان اور مغل رسم ورواج سے الگ کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم اٹھاتے ہوئے ۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔اس سے دو اثرات مرتب ہوئے ایک تو یہ کہ اردو کے فروغ وترقی میں اضافہ ہوا اور دوسرے یہ کہ فارسی جاننے والے لوگوں اور فارسی کے حامیوں پر اسکا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ویسے بھی مغلوں کے جانے کے بعد ہندستان میں فارسی زبان کی ترقی کے لئے کچھ خاص پیش رفت نہیں ہورہی تھی۔بعد میں اردو کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنادیا گیا۔بہرحال اردو زبان وادب کو اس سے فائدہ ہی ہوا اور اردو صحافت میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے بعد میں اردو صحافت کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۰ء میں فارسی کی سرکاری زبان کی حیثیت کو ختم کرکے اردو کو سرکاری زبان بنادیا۔اس سے انگریزوں کو سیاسی فائدہ پہنچایا نہیں البتہ اردو زبان کو اس سے بہرصورت فائدہ ہوا۔اردو کی تدریس وتعلیم بڑھ گئی۔عدالتوں میں اور دفتروں میں اردو میں کام ہونے لگا۔پھر اردو اخبارات کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔اردو صحافت کو انگریزی صحافت سے کچھ صحت مند روایات ورثے میں ملیں اور اس نے اسی کا اثر قبول کیا......مزید یہ کہ اس وقت کے زیادہ تر اردو اخبارات نے سرکاری گزٹ یا نیوز لیٹر بننے کے بجائے ابتداء میں ہی اپنا الگ تشخص قائم کیا۔'' ۴۹

دہلی اردو اخبار : کافی دنوں تک لوگوں نے مولانا محمد حسین آزاد کی بات کو صحیح جانا کہ دہلی اردو اخبار پہلا اردو اخبار تھا لیکن پھر بعد کی تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ دہلی اردو اخبار جس کا پہلا نام دہلی اخبار تھا پہلا نہیں بلکہ دوسرا اخبار تھا۔یہ اخبار دہلی اور شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار تھا۔اس کی تاریخ اجراء میں اختلاف ہے۔مارگریٹا بارنس نے ۱۸۳۸ء کہا ہے۔جب کہ محمد عتیق صدیقی کے مطابق ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا تھا۔جب کہ ڈاکٹر محمد باقر، جے نٹراجن اور قاسم علی سجن لال صاحب نے اخبار شروع ہونے کا سال ۱۸۳۶ء بنایا ہے۔اس بارے میں نادر علی خاں لکھتے ہیں۔

''یہ فیصلہ کرنا کہ دہلی اردو اخبار کہاں جاری ہوا تھا آسان نہیں ہے لیکن موجودہ حالات میں جب کہ ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۱ء موجود ہیں۔ تاریخ اجراء کے تعین کے سلسلے میں انہیں ۱۸۵۷ء کے شماروں پر یقیناً ترجیح دینی ہوگی۔ اور اسی لئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ اخبار فروری ۱۸۳۷ء میں جاری کیا گیا تھا۔'' ۵۰؎

اس اخبار کا نام اجراء کے وقت 'دہلی اخبار' تھا۔ اس اخبار کو مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 20X30/8 میں جاری کیا تھا۔

اس اخبار کا نام دو مرتبہ تبدیل کیا گیا تھا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں۔

''۳رمئی ۱۸۴۰ء تک اس کا نام دہلی اخبار رہا۔ پھر ۱۰رمئی ۱۸۴۰ء سے اس کا نام دہلی اردو اخبار ہوگیا۔ نام کی تبدیلی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جام جہاں نما کی طرح یہ بھی ہفت روزہ تھا اور آخر تک ہفت روزہ ہی رہا۔۔۔۔۔ اس اخبار کی قسمت میں آخری دنوں میں نام کی ایک اور تبدیلی لکھی ہوئی تھی۔ لہذا ۱۲رجولائی ۱۸۵۷ء کو اس کا نام بدل کر 'اخبار الظفر' رکھ دیا گیا۔'' ۵۱؎

اس اخبار میں صفحہ اول پر حضور والا کے عنوان سے مغل تاجدار اور قلعہ معلیٰ کی سرگرمیاں اور صاحب کلاں کے عنوان سے کمپنی کی حکومت کی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ اس میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں سے آنے والے اخبارات کے اقتباسات ہوتے تھے۔ اس اخبار کے لئے کچھ لوگوں سے رضا کارانہ طور پر بھی کام لیا جاتا تھا۔

اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس اخبار میں سیاست کے علاوہ معاشرے اور تعلیم و تمدن، سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ خبروں کے ساتھ ساتھ خبروں کے تبصرے بھی دیئے جاتے تھے۔ دہلی اردو اخبار میں شاعری پر خاصی توجہ دی جاتی تھی اور اس میں بہادر شاہ ظفر، ملکہ زینت محل، ذوق، غالب اور مومن کا کلام بھی چھپتا تھا۔ اخبار میں اداریہ نہیں ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں بھی دی جاتی تھیں۔

یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے کافی ترقی کی اور ایک لمبے عرصے تک نکلتا رہا۔ اور اسے اردو صحافت کا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے۔ اور مولوی باقر کو اردو کا پہلا نڈر صحافی کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے صحافت کو ایک تحریک کی طرح استعمال کیا اور اس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی رہے۔

''مولوی محمد باقر نے نہ صرف اردو زبان کے رائج الوقت اسلوب سے انحراف کیا بلکہ اپنے مقبول عام اخبار کے ذریعے دہلی کی علمی اور ادبی فضا کو عام کرنے کا بھی اہتمام کیا۔ شاعروں اور ادبی مجلس سے قطع نظر موجودہ ممتاز شعراء کا تازہ کلام زینت اخبار بنتا تھا۔ اور وہ اہل ذوق جو شعری مجالس سے محروم رہتے تھے اپنے اپنے مقامات پر ذوق سلیم کی تربیت و تسکین پاتے رہتے تھے۔ چنانچہ اعلیٰ شعری ذوق کی نشو ونما اور تہذیب و تربیت میں مولوی صاحب موصوف کی خدمات کا اعتراف ناگزیر ہے اور یہ دہلی اردو اخبار کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔'' ۵۲؎

دہلی اردو اخبار جس کا نام ۱۸۵۷ء میں اخبار الظفر کر دیا گیا تھا۔ ۱۳رستمبر ۱۸۵۷ء کو بند کر دیا گیا اور مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ اس طرح مولوی محمد باقر پہلے شہید صحافی کہے جاسکتے ہیں۔

''مولوی محمد باقر کی سرگرمیوں کی پاداش میں برطانوی حکام نے انہیں ۱۶ر ستمبر کو دہلی دروازے کے باہر میدان میں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس شہادت نے برصغیر میں نوزائیدہ اردو صحافت کو ایک بے نظیر اولیت عطا کر دی۔'' ۵۳؎

چاہے وہ ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف جنگ ہو یا ملکی یا غیر ملکی سرگرمیاں ہوں کسی بھی میدان میں صحافت

نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور سبھی موقعوں پر صحافت نے گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔ مولوی محمد باقر کی صحافت اور بعد میں ان کی شہادت نے صحافت کی تحریک کو جلا بخش دی۔

''یقیناً یہ مولوی محمد باقر ہی کی شہادت تھی جس نے اردو صحافت کو آغاز سے ہی ایک وقار، عزم اور تابانی بخشی اور اسے ایک امتیاز دلایا۔'' ۵۴؎

اخبار مظہرالحق : اس اخبار کو بھی مولوی محمد باقر نے ہی ۱۸۴۳ء میں شروع کیا تھا۔ اس اخبار میں شیعہ فرقہ کے خیالات کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ اس بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

''مظہر حق کے ہم عصر سراج الاخبار میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۴۳ء کے اوائل میں ایک بہت بڑا شیعہ سنی فساد بغداد میں ہوا تھا اور اس فساد میں شیعوں کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ ہندوستان کے سنی اخبار شاید اس قتل و غارت سے منکر تھے۔ چنانچہ مظہر حق کے اجراء کا مقصد صرف یہی تھا کہ اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ خبر قتل بغداد غلط ہے تو اس اخبار میں طویل عبارت کے ساتھ اس کا شافی جواب دیا جائے۔'' ۵۵؎

سیدالاخبار : یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اسے سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے شروع کیا تھا۔ بقول امداد صابری یہ ہفت روزہ ۱۸۳۷ء سے نکلنا شروع ہوا۔'' ۵۶؎ سید محمد خاں چونکہ سرکاری ملازمت میں تھے اس لئے ادارت کی ذمہ داری مولوی عبدالغفور کو ملی جو قانون کے داؤ پیچ سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے اخبار میں ایسے مضامین کا خاص اہتمام سے شائع کئے جاتے تھے جس میں قانونی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ اخبار وکیلوں میں خاصہ مقبول تھا۔ اسی اخبار سے سرسید احمد خاں کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور آگے چل کر سرسید احمد خاں ایک صاحب طرز اخبار نویس بنے۔ اس اخبار سے مرزا غالب کا بھی گہرا تعلق تھا۔

''غالب کے رقعات کے علاوہ مولانا حالی کی حیات جاوید اور یادگار غالب سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب اور سید احمد خاں میں گہرا دوستانہ تھا........اسی سلسلہ میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سیدالاخبار کے مطبع کو اس کا بھی فخر حاصل ہے کہ غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوا تھا۔'' ۵۷؎

یہ اخبار ۱۸۴۸ء تک جاری رہا۔

صادق الاخبار : صادق الاخبار کے نام سے دہلی سے چار اخبارات نکلتے تھے۔ پہلا فارسی میں تھا اور ۱۸۴۴ء میں شروع ہوا تھا اور بعد میں اردو میں تبدیل ہو گیا۔ یہ اخبار ۱۸۵۰ء سے پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۳ء میں پھر سے صادق الاخبار جاری ہوا اور ایک سال سے بھی کم عرصے تک جاری رہا۔ پھر تیسرا صادق الاخبار، سید جمیل الدین خاں نے ۱۸۵۴ء میں اور چوتھا ۱۸۵۶ء میں شیخ خدا بخش نے جاری کیا تھا۔ ان چاروں اخبارات میں سید جمیل الدین والا ہی اخبار زیادہ مقبول تھا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت تو وہ اخبار کافی مقبول تھا۔

کریم الاخبار : اس اخبار کو دلی کالج کے پروفیسر اور نامور ادیب مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اخبار ۱۸۴۸ء میں بند ہو گیا تھا۔

کوہ نور : یہ اخبار ۱۴ر جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے شروع ہوا تھا۔ اس اخبار کو منشی ہرسکھ رائے نے جاری کیا تھا۔ پہلے یہ اخبار ہفتے وار تھا، بعد میں ہفتے میں دو بار اور اس کے کچھ عرصے بعد ہفتے میں تین بار نکلنے لگا۔ ۱۸۶۶ء میں اس کے ایڈیٹر کو تین سال کی جیل ہو گئی تھی لیکن یہ اخبار پھر بھی جاری رہا۔ یہ اخبار اس لئے بھی کافی اہم ہے کہ پنجاب کا یہ پہلا اردو اخبار تھا۔ پنجاب کے بہت سے نامور صحافی 'کوہ نور' سے وابستہ رہے۔ کوہ نور تقریباً ۵۵ر سال تک شائع ہوتا رہا۔ کوہ نور میں خبریں کافی جذباتی انداز

سے شائع کی جاتی تھیں۔اس بارے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

''کوہ نور انتہا پسند اخبار تھا۔اس کی دوستی اور دشمنی دونوں حدود اعتدال سے نکل جایا کرتی تھی۔'' ۵۸؎

کچھ دوسرے اخبارات: کوہ نور کے بعد سراج الدین کی سرپرستی اور شہوار الدین کی ادارت میں 'دریائے نور' کے نام سے ایک اخبار شروع کیا گیا۔سیالکوٹ سے چشمِ فیض کے نام سے ایک اخبار نکلنا شروع ہوا۔اس کے مالک منشی دیوان چند تھے۔ سیالکوٹ سے 'معلم العلماء' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری ہوا تھا۔

۱۸۵۰ء میں گجرانوالہ سے منشی کنڈا مل کی ادارت میں 'گلزار پنجاب' کی شروعات ہوئی۔۱۸۵۴ء میں گجرات سے 'مطلع الانوار' نکلا۔۱۸۵۷ء میں پشاور سے 'خوش بہار' اور دو سال بعد راولپنڈی سے 'سہیل پنجاب' اور عنقائے روزگار جاری ہوئے۔لدھیانہ سے نور علی نور، امرتسر سے باغ نور، پشاور سے اخبار طبابت۔لاہور سے بحر حکمت اور معلم ہند کی شروعات ہوئی۔

دہلی سے ۱۸۴۶ء میں صدر الاخبار کی شروعات ہوئی۔بعد میں اس اخبار کا نام بدل کر اخبار الحقائق کر دیا گیا۔آگرہ سے اسعد الاخبار کے نام سے ایک اخبار ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا۔یہ ہفتہ وار تھا۔آگرہ سے ہی 'مطلع الاخبار' شیخ خادم علی کی ادارت میں شروع ہوا۔آگرہ سے قطب الاخبار، اخبار النوح، نور الابصار شائع ہوئے۔'سفیر آگرہ' کے نام سے منشی نول کشور نے ۱۸۵۶ء میں اخبار جاری کیا جس نے کافی شہرت حاصل کی۔ان کے علاوہ اخبار حسینی، مطلع العلوم، شرف الاخبار اور نزہت الارواح وغیرہ آگرہ سے شائع ہونے والے دوسرے اخبارات تھے۔

لکھنؤ سے 'لکھنؤ اخبار' ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا۔یہ لکھنؤ کا پہلا اخبار تھا۔اس کے بعد 'طلسم سامری' ۱۸۵۶ء، سحر سامری ۱۸۵۶ء میں ہی او 'مخزن الاخبار' بھی شائع ہوئے۔

مدراس سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہونے وال پہلا اخبار 'اعظم الاخبار' تھا۔اس کے بعد 'آفتاب عالمتاب' ۱۸۴۹ء تیسرا لاخبار ۱۸۴۹ء مظہر الاخبار ۱۸۵۶ء طلسم حیرت ۱۸۵۰ء میں اور اخبار 'جامع الاخبار' نکلنے شروع ہوئے۔

بنارس سے سدھا کر اخبار ۱۸۴۸ء میں شروع ہوا پہلے اردو اور ہندی دونوں میں نکلتا تھا پھر ۱۸۵۲ء میں صرف ہندی میں نکلنے لگا۔محمد عتیق صدیقی نے گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھا ہے۔

''یہ اخبار انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتا ہے۔پہلے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔مگر اب صرف ہندی میں شائع ہوتا ہے۔'' ۵۹؎

گوالیار اخبار ۱۸۵۳ء بنارس اخبار ۱۸۴۵ء، عمدۃ الاخبار بریلی ۱۸۴۹ء، مالوہ اخبار اندور ۱۸۴۹ء ضیاء الاخبار دہلی، ۱۸۴۹ء، مرزائی دہلی ۱۸۵۰ء، فیض لکھنؤ، ۱۸۵۱ء ، محمدی دلی ۱۸۵۲ء باغ و بہار بنارس ۱۸۵۱ء، ذوالفقار حیدری لکھنؤ، فتح الاخبار، نیر اعظم سیالکوٹ ۱۸۵۴ء، دوسرے اخبارات تھے۔

☆علمی اور ادبی جرائد

خیر خواہ ہند : یہ رسالہ ۱۸۳۷ء میں مرزاپور سے پادری آر۔سی۔ماتھر نے شروع کیا تھا۔فارسی اور اردو زبان میں مضامین شائع ہوتے تھے۔خیر خواہ ہند اردو کا پہلا رسالہ کہلاتا ہے۔اس رسالے کو پادری نے مذہب کی تبلیغ کے لئے شروع کیا تھا اور زیادہ تر مذہبی عقائد پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن اردو کا رسالہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہنچا۔

''خیر خواہ ہند کے اجراء سے عیسائیت کو کتنا نفع پہنچا یہ موضوع سے خارج ہے البتہ اس کے قیام سے نہ صرف

اردو زبان کا ایک مطبع مرزاپور سے جاری ہوا بلکہ اردو زبان جو شعر و شاعری اور داستان کے آہنی پنجے میں مقید تھی اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے وسیع تر ہوگئی۔'' ۶۰؎

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد 'خیر خواہ ہند' بند ہو گیا تھا اور پھر ۱۸۶۱ء میں دوبارہ شروع ہوا۔

قران السعدین: ۱۸۴۵ء میں دلی کالج کے پرنسپل مسٹر اسپرانگر نے یہ ہفت روزہ رسالہ شروع کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر دلی کالج کے شعبہ انگریزی کے اسکالر پنڈت دھرم نارائن تھے۔ اس رسالے میں مذہب، سائنس، زبان و ادب اور دوسرے تمام موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

فوائد الناظرین اور محب ہند: ان دونوں رسالوں کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے۔ فوائد الناظرین ۱۸۴۵ء میں اور محبّ ہند ۱۸۴۷ء میں شروع ہوا تھا۔ محبّ ہند کا پہلا نام خیر خواہ ہند تھا لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ خیر خواہ ہند کے نام سے ایک رسالہ شائع ہو رہا ہے تو اس کا نام محبّ ہند کر دیا گیا۔

> ''چونکہ ہم کو اس سے بالکل اطلاع نہ تھی کہ کوئی اخبار خیر خواہ ہند ہندوستان میں اجراء ہوتا ہے تو اس واسطے ہم نے اپنے رسالے کا نام خیر خواہ ہند رکھا تھا۔ اب ہم کو معلوم ہوا کہ اخبار مسمی خیر خواہ ہند مرزاپور میں جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں کہ ہم اپنے رسالے کا نام بھی خیر خواہ ہند رکھیں۔ اس واسطے ہم نے اس رسالے کا نام تبدیل کیا اور بجائے خیر خواہ ہند کے محبّ ہند رکھا۔'' ۶۱؎

☆کچھ دوسرے رسائل

۱۸۵۳ء میں منشی دیوان چند نے 'ہمائے بے بہا' شروع کیا۔ اس میں تعلیم اور سائنس کے تعلق سے زیادہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ محمد احسن کلانوری نے یکم جولائی ۱۸۵۴ء کو معلم ہند کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا۔ یہ ۳۲ صفحات کا رسالہ تھا اور اس میں تعلیم و تربیت پر زیادہ مواد ہوتا تھا۔ جنوری ۱۸۵۶ء میں خورشید پنجاب شروع ہوا جو اس وقت کا کافی معیاری رسالہ تھا۔ ۱۸۴۸ء میں معیار الشعراء آگرہ سے شروع ہوا۔ فوائد الشائقین کی شروعات ۱۸۴۶ء میں ہوتی تھی جو قانونی معاملات اور عدالتوں پر مشتمل مضامین شائع کرتا تھا۔ معدن القوانین کی شروعات ۱۸۵۶ء میں ہوئی تھی۔ اس میں بھی قانونی اور عدالتی فیصلوں کے تعلق سے کافی مواد شائع کیا جاتا تھا۔

☆۱۸۵۷ء کے بعد کی صحافت

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک اہم یادگار ہے۔ انگریزوں کے خلاف لڑی گئی اس پہلی جنگ نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کی ایک لہر سی پھیلا دی تھی۔ ملک کے سیاسی، معاشی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ زبان و ادب اور روزمرہ کی زندگی پر بھی کافی اثر پڑا۔ اس جنگ کے بعد ہندوستان کی صحافت نے بھی کئی کروٹیں لیں۔ جہاں کئی اخبارات کھل کر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے وہیں کچھ اخبارات انگریزوں کو خوش کرنے میں لگے تھے۔ اس جنگ آزادی کے بعد صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

اودھ اخبار: ۱۸۵۸ء میں اردو کا اہم اخبار اودھ پنچ شروع ہوا۔ اسے منشی نول کشور نے شروع کیا تھا۔ یہ اخبار شروع میں ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ لیکن ۱۸۷۴ء میں یہ روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔ اس اخبار نے زبان و ادب کی کافی خدمت کی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں سرشار، (فسانہ آزاد)، مولوی شوکت، عبدالحلیم شرر، مرزا غالب جیسے لوگ تھے۔ اس اخبار میں مذہب اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے کافی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار میں ایسے مقالات بھی شائع ہوئے تھے جن میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ مسلمان ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ذمہ دار نہیں تھے۔ اس اخبار نے برطانوی حکومت کی

مسلمانوں سے بدگمانیاں دور کرنے کی کوشش بھی کی۔اودھ اخبار اس وقت کا سب سے معیاری اخبار تھا۔اودھ اخبار کا اپنا کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا۔ یہ اخبار اصلاح معاشرہ،مغربی علوم وغیرہ پر بھی نظر رکھتا تھا۔بعد میں یہ اخبار سب سے زیادہ مزاحیہ صحافت کے لئے مشہور رہا۔اس اخبار میں تنقید اور مضحکہ اُڑانے کے لئے تصاویر اور کارٹون بھی استعمال کئے جاتے تھے۔اسکی ظرافت کافی مشہور تھی اور اس اخبار کے بعد مزاحیہ صحافت نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور کئے دوسرے اخبارات بھی شروع ہوئے۔

سائنٹفک سوسائیٹی : ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ کو سر سید احمد خاں نے علی گڑھ سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی شروعات کی۔جو سر سید کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔شروع میں ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہو گیا۔اسکے کالم انگریزی اور اردو دونوں میں ہوتے تھے۔اس اخبار کو انگریز بھی پڑھتے تھے۔خبروں کے علاوہ سر سید ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے مسائل اور ان کے معاملات کو اس اخبار کے ذریعے منظر عام پر لاتے تھے تاکہ انگریز حکومت کو عوام کے حالات کا پتہ چل سکے۔ ہندوستانیوں میں سیاسی نظریات،تعلیم وتربیت کے لئے بھی اس میں مضامین چھپتے تھے۔سر سید نے کئی بار اپنے مقالات کے ذریعہ اس اخبار میں مسلمانوں کی طرف سے صفائی بھی پیش کی اور انگریز حکومت کی بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

تہذیب الاخلاق : سر سید احمد خاں ۱۸۶۷ء میں انگلستان گئے تھے اور ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔انہوں نے انگلستان میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان لوٹ کر ایک رسالہ نکالیں گے اور واپس آ کر انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء سے تہذیب الاخلاق کی شروعات کی۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا اور اس کے بارہ صفحات ہوتے تھے۔اس میں خبریں نہیں ہوتی تھیں بلکہ صرف مضامین ہوتے تھے۔اس اخبار کا مقصد مسلم معاشرے کی اصلاح تھی۔سات ماہ کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا اور تین سال بعد پھر جاری ہوا۔مگر پھر دو سال پانچ ماہ کے بعد بند ہو گیا۔تقریباً ۱۴ سال کے بعد یہ رسالہ دوبارہ جاری ہوا۔مگر تین سال کے بعد ختم ہو گیا۔اس کے بار بار بند ہونے کی وجہ سر سید احمد خاں کی اپنی مصروفیات تھیں۔

اخبار انجمن پنجاب : ۱۸۶۴ء میں پنجاب کے ہندوؤں،سکھوں اور مسلمانوں نے مل کر انجمن اشاعت مطالب مفید پنجاب کی شروعات کی تھی۔اس انجمن کے مقاصد کو عام کرنے کے لئے اخبار انجمن پنجاب کی شروعات کی گئی۔اخبار انجمن پنجاب کے علاوہ آفتاب پنجاب،پنچ،وکیل،ہندوستان،نصرت الاخبار،دہلی،اخبار عالم،سبیل ہند،سفیر مدراس وغیرہ دوسرے رسائل تھے جو اس وقت نکلتے تھے۔

☆کچھ دوسرے اخبارات

رفیق ہند نامی اخبار مولوی محترم علی چشتی نے ۵؍جنوری ۱۸۸۴ء کو لاہور سے شروع کیا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔اور مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار۔ یہ اخبار ۱۹۰۴ء میں بند ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے کچھ دنوں بعد دہلی سے اکمل الاخبار کی شروعات ہوئی۔قیصر الاخبار الہ آباد سے شروع ہوا۔جو ہفت روزہ تھا۔اس میں غیر ملکی خبریں زیادی چھپتی تھیں۔الہ آباد سے ہی ۶؍جنوری ۱۸۷۶ء کو احسن الاخبار کا آغاز ہوا۔یہ بھی ہفت روزہ تھا۔اس میں ترجمہ کی ہوئی خبریں ہوتی تھیں۔خبروں کے علاوہ مضامین بھی ہوتے تھے۔یکم اگست ۱۸۹۰ء کو مولانا عبدالحلیم شرر نے ہفت روزہ کی صورت میں لکھنؤ سے مہذب شروع کیا۔ یہ اعلیٰ پایے کا اخبار تھا۔ یہ حکومت سے تعلقات کے معاملے میں سر سید کا حامی تھا۔لیکن سر سید کے بعض عقائد کا سختی سے مخالف تھا۔اس میں علمی،ادبی،تاریخی،سیاسی اور دینی ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے۔۱۸۵۸ء میں بمبئی سے کشف الامان منشی امان علی کی ادارت میں شروع ہوا۔مدراس سے ۱۸۵۹ء میں

شمس الاخبار شروع ہوا۔ شروع میں دس روزہ تھا پھر ہفت روزہ ہوگیا۔ اس کے مدیر سید عبدالستار تھے۔

اس اخبار میں زیادہ تر مواد عربی، فارسی اور ترکی اخباروں سے ترجمہ ہوکر چھپتا تھا، یہ اخبار ترکوں کی تائید کرتا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے "ہندوستانی" شروع ہوا۔ یہ ہفتے میں دو بار نکلتا تھا بعد میں تین بار نکلنے لگا۔ یہ کانگریس کی پرزور تائید کرتا تھا۔ مدراس سے جریدہ روزگار ۱۸۷۵ء میں شروع ہوا۔ یہ بھی ترکوں کا زبردست حامی تھا۔ بنگلور سے منشی محمد قاسم نے ۱۸۶۵ء میں قاسم الاخبار شروع کیا۔ میسور اخبار بنگلور ۱۸۷۳ء منشور محمدی بنگلور ۱۸۷۲ء اور شوکت اسلام بمبئی، اخبارات کی شروعات ہوئی۔

اردو کے پہلے روزنامے کی شروعات مولوی کبیرالدین احمد خاں بہادر نے کی تھی۔ مولوی صاحب نے کلکتہ سے اردو گائیڈ کے نام سے ایک روزنامہ شروع کیا۔

پیسہ اخبار : یہ اخبار ۱۸۸۷ء میں فیروز والہ (ضلع گوجرانوالہ) سے ہفت روزہ کی شکل میں جاری ہوا۔ اس کے مالک اور منتظم منشی محبوب علی عالم تھے۔ منشی محبوب عالم نے ہی ہفت روزہ ہمت شروع کیا تھا۔ پیسہ اخبار اپنے اجراء کے چند سال بعد لاہور منتقل ہوگیا اور صدی کے آخری سالوں میں روزنامہ بن گیا۔ یہ اخبار کافی مقبول ہوا۔ مسلمانوں کے حق کی لڑائی میں پیسہ اخبار کا جواب نہیں تھا۔ اردو صحافت کی ترقی میں پیسہ اخبار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ متانت، سنجیدگی اور صحافت کو ایک تحریک کے طور پر چلانا اس اخبار کی اہم خصوصیات تھیں۔ امداد صابری مولوی محمد دین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پیسہ اخبار وہ مضامین شائع کرتا تھا جو پبلک کے لئے نفع بخش ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ اخبار اپنی ارزاں قیمت اور نہایت دل چسپ اور عام پسند مضامین کی بدولت بہت جلد ہندوستان کا ٹائٹ بٹس بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس ہونہار بچے نے تمام بوڑھے اخبارات کو اپنی لیاقت اور ذہانت کا معترف بنالیا اور انہوں نے اس کی فضیلت اور برتری کو تسلیم کرلیا۔" ۶۲

یہ پہلا اخبار تھا جس کی تعداد اشاعت اس وقت گیارہ ہزار تھی۔ اس میں کافی اشتہارات بھی شائع کئے جاتے تھے۔ زمیندار جب روزنامہ ہوا اس سے پہلے یہ اردو کے تمام اخبارات میں سب سے اہم اور مقبول تھا۔ اس کی خبریں اور مضامین عوام بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ لیکن جب 'زمیندار' مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں سے مزیّن ہوکر صحافت کے سفر میں وارد ہوا تو پیسہ اخبار کی قیمت بہت ہی کم ہوگئی اور عوام میں اس کی مقبولیت بھی کم ہوگئی یہ اخبار ۱۹۲۴ء میں بند ہوگیا۔ اس اخبار نے مکتب صحافت کا کام بھی کیا اور اس سے جڑے لوگوں نے آگے چل کر صحافت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

بیسویں صدی کی گود میں بہت سے ہنگاموں اور انقلابات نے جنم لیا۔ اور دنیا کے سیاسی نقشے پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اسی کے ساتھ اردو صحافت میں بھی انقلاب آیا۔ اس سلسلے میں رئیس الدین فریدی لکھتے ہیں:

> "مسلم لیگ کا قیام، تقسیم بنگال کی تجویز، ایشیا اور افریقہ پر مغربی ملکوں کی تاخت وتاراج کانپور کی مسجد کا واقعہ، ترکی سلطنت کی تباہی کا آغاز، پہلی عالمی جنگ، جلیاں والا باغ کی خوں ریزی وغیرہ نے جمع ہوکر سوراج اور خلافت کی تحریک کا راستہ تیار کیا۔ اس سے اردو اخبارات بھی شدت سے متاثر ہوئے اور نئے نئے اخبارات نکلنے لگے۔ ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ انگریزوں کے خوشامدی اخبار دب گئے اور اردو صحافت انگریزوں کی مخالفت کے لئے شمشیر عریاں ہوگئی۔ یعنی پچاس سال سے بھی کم مدت میں ۱۸۳۷ء کا سماں پھر پیدا ہوگیا۔ ان دنوں اردو اخباروں کی اشاعت بھی کافی بڑھ گئی۔ یہ دور اردو صحافت کا سنہری دور تھا۔" ۶۳

بیسویں صدی کی شروعات ہوئی تو کئی نئے اخبارات کا آغاز ہوا۔ کچھ اخبارات تو پہلے سے ہی نکل رہے تھے جن میں وکیل امرتسر، صلح کل، پیسہ اخبار اور اودھ اخبار کا نام لیا جاسکتا ہے۔

نئے شروع ہونے والے رسائل میں مولانا حسرت موہانی کا ماہانہ رسالہ اردوئے معلیٰ کافی اہمیت کا حامل ہے۔اسکا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس وقت عبدالحلیم شرر کا دلگداز، عبدالقادر کا مخزن اور منشی دیا نارائن نگم کا زمانہ اہم رسائل تھے۔مولانا حسرت موہانی ہندوستان کی آزادی کے ایک سرگرم رکن تھے اور انہوں نے صحافت کے ذریعہ آزادی کی آگ کو تیز کیا۔اس کے لئے انہیں کئی صعوبتیں اور مصیبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ان کے رسالے اردوئے معلیٰ کو کئی بار ضبط بھی کیا گیا۔اسمیں مضامین، اشتہارات اور شعری تخلیقات بھی شائع ہوتی تھیں۔اسمیں سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔شعری تخلیقات کے لئے ایک باضابطہ سلسلہ حصہ نظم شائع ہوتا تھا۔جس میں اہم شعراء کی نظمیں اور غزلیں وغیرہ شائع کی جاتی تھیں۔اسلامی تاریخ اور قانونی معاملات پر مشتمل مضامین بھی اس اہم رسالے کی زینت بنتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین احمد نے جون ۱۹۰۳ء میں کرم آباد سے ہفت روزہ اخبار زمیندار جاری کیا۔جس کا مقصد زمینداروں، کسانوں اور کاشتکاروں کی بھلائی کے لئے کام کرنا تھا۔نومبر ۱۹۰۹ء میں ان کے انتقال کے بعد اس کی ادارت مولانا ظفر علی خاں نے سنبھالی۔اور اس کے دفتر کو کرم آباد سے لاہور منتقل کیا گیا اور روزانہ میں تبدیل ہو گیا۔ یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے رائٹر اور ایسوسی ایٹ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔زمیندار مسلمانوں کی آواز بن کر ابھرا اور اپنے زمانے کا سب سے مقبول اخبار بن گیا۔جنگ آزادی کی لو کو تیز کرنے میں بھی زمیندار کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

”زمیندار وہ پہلا اخبار تھا۔جس نے عوام کے اندر خود اعتمادی، قومی بیداری اور انگریز دشمنی کا لاوا بھر دیا..........اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی مولانا ظفر علی خاں نے اپنے قلم کو شمشیر بنالیا اور سامراجی طاقتوں کے خلاف طوفان بن کر ٹوٹ پڑے۔“۲۴

زمیندار کی بے باکی اور ہر دل عزیزی سے حکام ناراض ہو گئے۔اور زمیندار پر ۱۰ ہزار روپے جرمانہ ادا کرنے کا مطالبہ ہوا۔اور جمع نہ کرنے پر اس کے پریس کو ضبط کر لیا گیا۔لیکن بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کو پھر شروع کیا۔لیکن مالی دشواریوں کی بنا پر ۱۹۲۷ء میں بند ہو گیا۔“

زمیندار کے ساتھ ساتھ اس وقت پنجہ فولاد لاہور ۱۹۰۹ء، وطن لاہور ۱۹۰۲ء، ہندوستان لاہور ۱۹۰۴ء دیپک لاہور ۱۹۰۴ء کشمیری میگزین ۱۹۰۶ء، مسلم گزٹ لکھنؤ، علم وعمل حیدرآباد ۱۹۰۴ء، صحیفہ ۱۹۱۱ء معارف لکھنؤ ۱۹۱۱ء دوسرے اہم اخبارات تھے جو نکل رہے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مدینہ بجنور کو عبدالمجید احمد نے شروع کیا تھا۔اس اخبار نے آزادی کی تحریک اور خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔کانگریس اور جمعیتہ العلماء کا حامی یہ اخبار کافی دنوں تک نکلتا رہا۔عبدالمجید صاحب کے بعد ان کے فرزند سعید اختر ایم اے نے اس کی ادارت سنبھالی۔

مولانا محمد علی جوہر نے کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ شروع کیا۔بعد میں دارالحکومت دہلی منتقل ہو جانے سے اس کے دفتر کو دہلی منتقل کر لیا۔اور یہاں سے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو اردو روزنامہ ہمدرد شروع کیا۔یہ ایک اعلیٰ پائے کا اخبار تھا۔مولانا نے اپنی تعلیمی لیاقت کا استعمال کرتے ہوئے انگریزوں کے خلاف ایسے شعلہ بیان اداریے اور مضامین تحریر کئے کہ انگریزی ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا اور کامریڈ اور ہمدرد دونوں اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی۔مولانا محمد علی کا نام صحافت کی تاریخ میں سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔انہوں نے صحافت کو فن کی طرح استعمال کیا اور ایک تحریک چلائی۔انہوں نے پہلی بار روزانہ اخبار میں ٹائپ کا استعمال کیا۔انہوں نے خبروں، اداریوں اور مضامین کے اعتبار سے بھی اپنا ایک صحافتی معیار قائم کیا جو بعد کے صحافیوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔

”نئے ٹائپ کے حسن کے علاوہ یہ اخبار اپنے مواد میں بھی ایک خاصے کی چیز تھا۔جہاں دیدہ اور ذی فہم مولانا محمد علی کے خیالات، خبروں کی تازگی اور ملک کے قابل اور ممتاز مضمون نگاروں اور شعراء کے

تعاون سے یہ جلد ہی مقبول ہو گیا۔ اور اردو سماج اپنے نئے روزنامے پر شرف وافتخار محسوس کرنے لگا۔ پہلے ہی سال کے اندر اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی۔'' ۶۵

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ہفتہ وار ''الہلال'' سے صحافت کے میدان کو منور کر دیا۔ مولانا پہلے سے ہی صحافت کے جہاں میں قدم رکھ چکے تھے انہوں نے ایک گلدستہ نیرنگ عالم ۱۸۹۹ء میں جاری کیا بعد میں انہوں نے رسالہ لسان الصدق (۱۹۰۵-۱۹۰۳ء) جاری کیا۔ الہلال کے جاری ہونے کے بعد اردو صحافت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اردو صحافت کو انقلابی جوش وجذبہ مولانا کے اخبارات الہلال اور البلاغ نے بخشا۔

''مولانا آزاد نے اردو کو صحافت کے بین الاقوامی معیار سے روشناس کرایا۔ صحافت کو جدید ترین تکنیک کا حامل بنایا اور قارئین کو اس طرح مواد فراہم کیا کہ انہیں پھر کسی اور زبان کے اخبار یا رسالہ پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔'' ۶۶

الہلال نے قوم کو جھنجھوڑ کر غلامی کی نیند سے بیدار کیا اور برطانوی حکومت کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ الہلال میں مذہب وسیاست، معاشیات ونفسیات، جغرافیہ، تاریخ وعمرانیات وسوانح، ادب اور حالات حاضرہ پر اعلیٰ قسم کے مضامین اور تبصرے شائع ہوتے تھے۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور سید سلیمان ندوی جیسے اہم اور بلند پایہ اکابر کی بھی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا بھی جرأت اور بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو حکومت نے الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی بعد میں دس ہزار کی نئی ضمانت مانگی جو منظور نہ ہونے پر الہلال کے پریس کو بند کر دیا گیا۔ اسی درمیان البلاغ کی شروعات ہوئی، لیکن مولانا کی نظر بندی کی وجہ سے بند ہو گیا۔ بعد میں الہلال ۱۹۲۷ء میں جاری ہوا لیکن چھ ماہ میں ہی بند ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ملک میں ہندو مسلم ایکتا کے حامی تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اس ملک کے بنانے میں کسی ایک قوم اور مذہب کا تنہا حصہ نہیں۔ یہ ملک مختلف مذاہب وادیان کی آماجگاہ رہا ہے۔ مولانا آزاد اپنے نظریات کو عام کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہے اور اس کے لئے انہیں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں اور صحافت کے میدان میں وہ آج بھی اپنی عظمت میں یکتا وتنہا نظر آتے ہیں۔ سیاست ۱۹۱۹ء میں مولانا سید حبیب نے لاہور سے جاری کیا۔ دوسرے اخبارات میں ہمدم، پرتاپ، بندے ماترم ۱۹۲۰ء، کیسری اور گوروگھنٹال ۱۹۲۱ء، ملاپ ۱۹۲۳ء لاہور، تیج ۱۹۲۳ء، دہلی وغیرہ مشہور اخبارات تھے۔ پرتاپ اور تیج آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ جمیعۃ العلماء ہند کا ترجمان الجمیعۃ ۱۹۲۵ء سے جاری ہونا شروع ہوا۔ یہ اخبار پہلے سہ روزہ تھا پھر بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ یہ اخبار آزادی کے بعد بھی جاری رہا۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادارت میں اس اخبار نے کافی ترقی کی۔ ۱۹۲۵ء میں پٹنہ سے صدائے عام ۱۹۲۷ء میں لاہور سے انقلاب اور ۱۹۳۴ء میں لاہور سے 'احسان' جاری ہوئے۔ عبدالحمید انصاری کا ۱۹۳۸ء میں شروع کیا گیا اخبار انقلاب آج بھی بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار کے مقبول صحافیوں میں کلدیپ نیر، منور مادیوان اور ایم جے اکبر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ شاہد صدیقی کا نئی دنیا، عزیز برنی کا راشٹریہ سہارا آج کے دور کے مقبول اخبارات ہیں۔ حیدرآباد سے اردو زبان کی بڑی خدمت ہو رہی ہے اور وہاں صحافت کے میدان میں کافی معرکے ہو رہے ہیں۔ زاہد علی خاں کی زیر ادارت سیاست اور خان لطیف محمد خاں کا منصف کافی اہم اخبارات ہیں۔ یہ دونوں اخبارات کسی بھی انگریزی اخبارات کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق منصف پورے ملک کا اردو زبان کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا روزنامہ ہے۔ ان دونوں اخبارات کو اشتہارات بھی کافی ملتے ہیں اور مغربی نیوز ایجنسی سے حاصل شدہ خبریں دی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۰ر دسمبر ۲۰۰۵ء میں دارالسلام گروپ کے اویسی برادران نے حیدرآباد سے ہی روزنامہ 'اعتماد' کی اشاعت کا آغاز کیا ہے۔ یہ اخبار انگریزی اخبارات کی طرز پر ہے اور اس کے اداریے کافی اچھے ہوتے ہیں۔

اردو صحافت آج جس طرح سے ترقی کی منازل طے کر رہی ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو صحافت کا مستقبل روشن ہے۔ اردو زبان کی جو چاشنی ہے جو شیرینی ہے وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اردو اخبارات بھی اب انگریزی اور ہندی اخباروں کی طرح دنیا کی مختلف خبر رساں ایجنسیوں سے خبریں لیتے ہیں۔

اردو اخبارات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں علاقائی خبریں زیادہ چھپتی ہیں جس سے لوگوں کو اپنے ملک کے بیشتر حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔ اردو صحافت کے ساتھ کچھ پریشانیاں تو ضرور ہیں، جیسے اچھے صحافیوں کی کمی اور مالی تعاون کی کمی لیکن اس کے باوجود آج اردو صحافت کافی حد تک دور حاضر کی صحافت کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہے۔ آج کے اردو اخبارات راشٹریہ سہارا، منصف، سیاست وغیرہ نے اردو پڑھنے والوں کے ایک بڑے حلقے تک اپنی رسائی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے جس سے نہ صرف زبان کی توسیع ہوئی ہے بلکہ یہ بھی باور ہوتا ہے کہ اردو عوام کی زبان ہے۔ اردو صحافت سے اردو زبان کا بھی بھلا ہوا اور لوگ مشکل اور ثقیل الفاظ کے بجائے آسان اور عام فہم الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

ملک میں اردو جاننے والوں کی ایک کافی بڑی تعداد ہے جو انگریزی اور ہندی اخبارات کا مطالعہ کرتی ہے انہیں چاہئے کہ ساتھ ہی ساتھ اردو اخبارات کا بھی مطالعہ کریں۔ کیونکہ اردو ہماری زبان ہے اور اس کو فروغ دینا بھی ہمارا فرض ہے۔ اردو صحافت ہندوستان کی قدیم ترین اور تاریخی اعتبار سے مؤثر اور موقر صحافت ہے۔ ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اردو صحافت نے تعمیری کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان کے جرائد و اخبارات کافی بڑی تعداد میں ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہو رہے ہیں۔ اردو صحافت کو ابھی ترقی کے اور منازل طے کرنے ہوں گے۔ اردو صحافیوں کو صحافت کے نئے طور طریقے، نئے انداز فکر کو اپنانا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ کن وجوہات کی بنا پر دوسری زبانوں کی صحافت زیادہ ترقی پر ہے۔

اگر اس سلسلے میں تعمیری کام انجام دیے گئے تو اردو صحافت یقیناً دوسری زبانوں کی صحافت میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ منظّم ہوجائیگی۔ جو دراصل اردو صحافت کے ساتھ ساتھ اردو بولنے والوں اردو لکھنے والوں اور اردو پڑھنے والوں کی کامیابی ہوگی۔

حواشی

۱۔ڈاکٹر جاوید حیات، مبادیات صحافت، مکتبہ آزاد گلزار لین پٹنہ۱۹۸۸ء ص۔۱۱
۲۔ایضاً ص۔۷
۳۔عبدالسلام خورشید، فن صحافت مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۶۳ء ص۔۹
۴۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء ص۔۴۴
۵۔آکسفورڈ ڈکشنری، آکسفور یونیورسٹی پریس،۲۰۰۰ء ص۔۶۹۹
۶۔سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورنئی دہلی ۲۰۰۰ء ص۔۲۱
۷۔عبدالسلام خورشید، فن صحافت، مجلس ترقی اردو ادب، لاہور۔۱۹۶۳ء ص۔۱۱
۸۔ایم وی کاماتھ، ایم کے رستم جی۔ وہاٹ جرنلزم از آل اباؤٹ انڈیا بک ہاؤس
پرائیوٹ لمٹیڈ۔۱۹۸۶ء ص۔۳
۹۔ڈیوڈ وین رائٹ، جرنلزم میڈ سمپل، روپا پیپر بیک، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲ص۔۳
۱۰۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۲۰۰۳ء ص۔۴۵
۱۱۔ایضاً ص۔۴۵
۱۲۔سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔۲۰۰۰ء ص۔۲۱
۱۳۔نذرالحفیظ ندوی، مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔۲۰۰۱ء ص۔۱۴۱
۱۴۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند،
علی گڑھ،۱۹۵۷ء ص۔۳۵۹
۱۵۔ پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۳ء ص۔۳۵۔۳۶
۱۶۔عبدالسلام خورشید، فن صحافت، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء ص۔۱۰
۱۷۔جوزف آرڈومنک، ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن، میک گراہل پبلیکیشن نیویارک۱۹۹۲ء ص۔۸۰
۱۸۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ،۱۹۵۷ء ص۔۲۰۔۱۹
۱۹۔جوزف آرڈومنک، ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن، میک گراہل پبلیکیشن نیویارک۱۹۹۲ء ص۔۸۰
۲۰۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ ص۔۲۱
۲۱۔سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۲۰۰۰ء ص۔۲۹
۲۲۔جوزف آل ڈومنک، ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن، میک گراہل پبلیکیشن نیویارک۱۹۹۲ء ص۔۸۱
۲۳۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ ص۔۲۵
۲۴۔جے نٹراجن، بھارتیہ پترکاریتا کا اتہاس، پبلیکیشن ڈویزن، نئی دہلی۲۰۰۲ء ص۔۲
۲۵۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند،
علی گڑھ،۱۹۵۷ ص۔۲۵

۲۶۔ایضاً ص۔۲۸
۲۷۔ایضاً ص۔۳۴
۲۸۔ایضاً ص۔۵۵
۲۹۔ایضاً ص۔۵۶
۳۰۔ایضاً ص۔۵۸
۳۱۔ایضاً ص۔۶۴
۳۲۔پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۶،۲۰۰۳ء ص۔۶۳
۳۳۔ایضاً ص۔۶۴
۳۴۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء ص۔۸۲
۳۵۔پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۳ء ص۔۶۶
۳۶۔جے نٹراجن، بھارتیہ پتر کاریتا کا اتہاس، پبلیکیشن ڈویژن، نئی دہلی ۲۰۰۲ء ص۔۱۱
۳۷۔ہندی پتر کاریتا ویویدھ آیام، ڈاکٹر وید پرتاپ ویدک، نیشنل پبلشنگ ہاؤس،
نئی دہلی۔ص۔۳۰
۳۸۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء ص۔۱۲۵
۳۹۔ایضاً ص۔۱۴۸
۴۰۔ایضاً ص۔۱۶۰
۴۱۔مولانا امداد صابری، روح صحافت، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔۶،۱۹۶۸ء ص۔۲۳
۴۲۔عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۶۳ء ص۔۳۶۔۳۵
۴۳۔نادر علی خان، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء ص۔۳۵
۴۴۔ایضاً ص۔۳۶
۴۵۔ایضاً ص۔۳۷
۴۶۔ایضاً ص۔۳۹
۴۷۔ایضاً ص۔۹۳
۴۸۔ایضاً ص۔۵۱
۴۹۔پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۳ء ص۔۷۸
۵۰۔نادر علی خان، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۷ء ص۔۷۵
۵۱۔پروفیسر محمد شاہد حسین، ابلاغیات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۳ء ص۔۷۹
۵۲۔نادر علی خان، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۷ء ص۔۹۷
۵۳۔پروفیسر فضل الرحمٰن (مضمون) اردو انسائیکلو پیڈیا، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ص۔۵۸۵
۵۴۔سنجر ہلال بھارتی (مضمون) تحریک آزادی اور اردو صحافت، ماہنامہ، نیا دور، لکھنؤ، اگست ۱۹۹۹ء ص۔۲۰
۵۵۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء ص۔۲۷۷
۵۶۔امداد صابری، تاریخ صحافت اردو۔جلد اول، جدید پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۶۲ء ص۔۲۲۲

۵۷۔محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء ص۔۲۷۸

۵۸۔ایضاً ص۔۳۰۲

۵۹۔ایضاً ص۔۲۹۳

۶۰۔نادر علی خاں، اردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء ص۔۲۴۸

۶۱۔ایضاً ص۔۱۹۰

۶۲۔امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، حصہ سوم جدید پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۶۲ء ص۔۵۱۹

۶۳۔انور علی دہلوی، (مرتبہ) اردو صحافت، دہلی اردو اکادمی، ص۔۴۳

۶۴۔سنجر ہلال بھارتی، مضمون تحریک آزادی اور اردو صحافت، ماہنامہ نیا دور اگست ۱۹۹۹ ص۔۲۳۔۲۲

۶۵۔عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء ص۔۳۶۲

۶۶۔قطب اللہ، مولانا آزاد کا نظریہ صحافت، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ص۔۱۱

سرسید احمد خاں کی صحافتی خدمات

☆مختصر سوانح حیات

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کے بعد مسلمانوں کے لئے حالات بہت بدتر ہو چکے تھے اور اس انقلاب سے سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی مسلمانوں کا ہوا تھا۔ ایک تو ان پر بغاوت کا الزام لگا دوسرے انہیں سماجی، معاشی و تعلیمی ترقی میں پیچھے کر دیا گیا۔ اور وہ تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ اگر ہم آج کے حالات کا جائزہ لیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج ہندستانی مسلمان تعلیمی اعتبار سے کافی اچھے ہیں اور زندگی کے تمام تر شعبے میں ترقی کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت کے حالات اتنے بدتر ہو چکے تھے کہ نہ کوئی پرسان حال تھا اور نہ ہی ان کی حالات زار پر کوئی رونے والا۔ ایسے ہی وقت میں سرسید احمد خاں نے ہندستانی مسلمانوں کی حالت دیکھتے ہوئے اپنی کوششوں سے، اپنی صحافت سے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا اور مسلمانوں کو تباہی سے بچالیا۔ سرسید نے اپنی زندگی کو قوم کے لئے وقف کر دیا تھا اور اپنی تحریک سے ایک نئے عہد کی شروعات کی۔ ان کی کوششوں کی بدولت ہی مسلمان تعلیم اور دیگر شعبوں کی جانب متوجہ ہوئے۔

نام۔ سید احمد، خطاب۔ سر، اعزاز۔ سی ایس آئی اور کے سی ایس آئی، والد۔ میر متقی، والدہ۔ عزیز النساء، دادا۔ سید ہادی، پردادا۔ سید عماد، چھپر دادا۔ سید برہان، مورث اعلیٰ۔ سید محمد دوست۔

سید محمد دوست اورنگ زیب عالم گیر کے ہمراہ دکن کی مہم میں شریک ہوئے تھے۔ بعد میں وہ دکن میں ہی بس گئے۔ ان کے لڑکے سید برہان نے دکن سے دہلی آکر سکونت اختیار کر لی۔ ان کے فرزند تھے سید عماد، اور ان کے دو بیٹے تھے۔ سید ہادی اور سید مہدی۔ سید ہادی کو خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری دیا گیا۔ جب شاہ عالم بادشاہ ہوا تو خطاب جوادالدولہ دیا گیا اور عہدہ قضائے لشکر عنایت ہوا۔ سید ہادی کے مرنے کے بعد ان کے دوست خواجہ فرید نے اپنی بیٹی کی شادی ان کے بیٹے میر متقی سے کر دی۔ میر متقی شادی کے بعد خواجہ فرید کے ہی گھر میں رہنے لگے۔ وہیں سید احمد کی پیدائش ہوئی۔ بچپن کی تعلیم ایسے ہی بے دلی سے پوری کی۔ خواجہ فرید کے مرنے کے بعد اور بھی آزادی مل گئی اور خوب شرارتیں کرنے لگے۔ پڑھائی سے زیادہ رجحان کھیلوں کی طرف تھا۔ تیراندازی، پتنگ بازی اور تیراکی میں خوب مہارت حاصل تھی۔

سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء بیگم کی شخصیت کافی متاثر کن تھی۔ ان کی پرورش اور تربیت نے سرسید احمد خان کی زندگی اور اندازِ فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ ایک مرتبہ سید احمد خاں نے کسی ملازم کو تھپڑ مار دیا۔ اس بات سے ناراض ہو کر ان کی والدہ نے فوراً ان کو گھر سے باہر کر دیا۔ اور تین دن کے بعد اس شرط پر واپسی کی اجازت دی کہ ملازم سے معافی مانگیں۔

سید احمد نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ایک عام نوجوان کی طرح جوانی کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ ہولی کے میلے، پھول والوں کی سیر، بسنت کے میلے، راگ رنگ کی محفلیں غرض کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ کبھی کبھی طوائفوں کے یہاں بھی جانا ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں۔

> ''جوانی کی نمائش میں اگر حسن کی دکانیں نہ ہوں تو سید کا لطف ہی کیا۔ اس کمی کو طوائفوں کے ناز و انداز سے پورا کیا جا رہا تھا اور اسی کو تہذیب سمجھا جا رہا تھا۔ ایک نشہ تھا جو آہستہ آہستہ سب کو سلائے دے رہا تھا۔ امیر زادوں کے محلات موسیقی کی تانوں سے گونج رہے تھے۔ سید احمد بھی اس متعدی مرض سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔''[1]

والدہ نے جب یہ کارنامے سنے تو ہکا بکا رہ گئیں اور صرف ۱۸ رسال کی عمر میں ان کی شادی خالہ زاد سے کر دی۔

والدہ نے اس لیے شادی کردی تھی کہ وہ گھر کی ذمہ داری کو سمجھے گا اور باہر کی ہوا سے دور رہے گا لیکن شادی تو ایک دن کی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد سید احمد نے پھر بازار کی رونق کی طرف نظر کی۔ ان سب کے ساتھ ساتھ کتابوں کے مطالعے کا بھی شوق تھا۔ اور دہلی کے امراء ورؤسا کی محفل میں بھی جا کر بیٹھتے تھے۔ دہلی کے اس وقت کے مشہور شاعر غالبؔ، صہبائیؔ، آزردہ، وغیرہ سے ملنے جاتے تھے اور ان کی علمی مجلسوں میں بھی شامل ہوتے تھے۔ اس وقت ادبی ذوق وشوق رکھنا امیرانہ شان کی نشانی تھی۔

یہی شب وروز تھے کہ والد میر متقی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ والد کی موت کے بعد سید احمد کو گھر کا خیال آیا۔ ایک انگریز افسر مسٹر ہملٹن نے سید احمد کو نائب منشی بنادیا۔ سید احمد کو غالب کی دیکھا دیکھی جب لکھنے کا شوق ہوا تو ایک کتاب فارسی میں جام جم کے نام سے ۱۸۴۰ء میں مرتب کردی۔ پھر دھیرے دھیرے مطالعے کا اور شوق بڑھا تو تین مذہبی رسائل تصنیف کیے اور پھر دہلی کی عمارتوں پر تحقیق کرنا شروع کیا اور نتیجہ آثارالصنادید کی شکل میں سامنے آیا۔ آثارالصنادید ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب انھوں نے دہلی میں منصفی کے زمانے میں لکھی تھی۔ یہ کام انھوں نے جس محنت اور جانفشانی سے کیا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ قطب مینار کے اکثر کتبے پڑھنے کے لیے انھوں نے باڑھ تک بندھوائے۔ اس کتاب کا ترجمہ مسٹر رابرٹس کلکٹر ومجسٹریٹ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے ذریعہ کروایا اور سید احمد کو سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۸۶۱ء تک اس کتاب کا فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہوچکا تھا۔

جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہوئی تو سید احمد خاں بجنور میں تھے اور صدر امین کے عہدے پر فائز تھے۔ دہلی کے بعد بغاوت کی لہریں بجنور تک پہنچیں اور انگریز حاکموں کو خوف محسوس ہوا تو سرسید ایک جوان مرد بن کر سامنے آئے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

> ''مسٹر شیکسپیر جو اس زمانے میں بجنور کے کلکٹر ومجسٹریٹ تھے گو کہ سرسید کو باعتبار عہدے کے ان سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیر اور مسز شکسپیر سے ان کی بہت راہ ورسم تھی..................
>
> .... جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شیکسپیر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔''[۲]

اور اس رات سرسید اسلحے سے لیس ہوکر ساری رات پہرہ دیتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ حوصلے بھی بڑھاتے جاتے تھے۔ سید احمد نے ہندوستانی حفاظتی دستوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ محمد رحمت اللہ ڈپٹی مجسٹریٹ اپنے مصاحبوں کو لے کر رات بھر گشت کرتے رہے۔ اور پھر سید احمد، سید تراب علی تحصیل کے ساتھ بجنور کی اندھیری راتوں میں جیل خانے اور خزانے اور انگریز حاکموں کی کوٹھی کا دورہ کرتے رہے۔ سید احمد نے بغاوت کے ختم ہونے پر مسلمانوں کی تباہی و بربادی دیکھی تو ان کا دل بھر آیا اور انھوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریز حکمرانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ بغاوت کے ذمہ دار مسلمان نہیں تھے۔ سید احمد نے مسلمانوں کی تعلیمی حالت سدھارنے کے لیے ایک تحریک شروع کی اور اسی لیے وہ ولایت گئے جہاں انھوں نے ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا جواب بھی لکھا۔ پیرس، لندن، اسکندریہ وغیرہ کی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد وہ وطن واپس آئے۔ وہاں سے وہ مسلمانوں کی ناخواندگی، ناکامیابی اور پستی کا حال معلوم کر کے لوٹے تھے۔ ہندوستان واپس آنے پر مسلمانوں نے کافی مخالفت کی اور کرسٹان (کرسچن) کا خطاب دے ڈالا۔ کئی علماء نے تو کفر کا فتویٰ بھی صادر کردیا لیکن سید احمد کو صرف اور صرف قوم کی فکر تھی۔ انھوں نے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور اپنے کام میں لگے رہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد تو انھوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی رکھ دی تھی اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی شائع

ہونا شروع ہو چکا تھا۔کئی انگریزی کتابوں کے تراجم پر بھی کام ہو رہا تھا۔لندن سے واپس آنے کے بعد انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رسالہ تہذیب الاخلاق کی شروعات کی۔اس رسالے میں مسلمانوں کی تعلیم و ترقی، مذہب، سماجی مسائل کے موضوعات پر مضامین شائع کرنے شروع کیے۔مذہبی عقائد و خیالات جو ترقی میں مانع تھے۔ان پر بھی کافی کچھ لکھا۔عبادت کا صحیح مفہوم، پیری مریدی، اہل کتاب کے ساتھ معاملات ان سب پر عقلی دلیل سے روشنی ڈالی جس کی کافی مخالفت کی گئی۔ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔اور مسلمانوں کی ترقی میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کی پسماندگی جاننے کے لیے اعلان کروایا۔ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری اسکولوں میں مسلمان کم کیوں پڑھتے ہیں۔اس کے اسباب کا پتہ لگایا جائے اور حل ڈھونڈھا جائے۔ان سب کاموں کے لیے انگریزوں اور مسلمانوں سے چندہ جمع کیا۔اس کمیٹی کے جلسے سے ایک دن پہلے سید احمد رات بھر جاگتے رہے تھے اور رو رو کر کہتے رہتے تھے کہ مسلمان بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جا رہے ہیں۔کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔اس جلسے میں رپورٹ پیش کی گئی جسے گورنمنٹ کو بھی دیا گیا۔اس رپورٹ کے مطابق یہ بات سامنے آئی کہ مسلمانوں کو اپنی تعلیم کی فکر خود کرنی ہوگی۔سرکار نے کہا کہ اگر کمیٹی کسی کالج کا قیام کرتی ہے تو حکومت اس کی امداد کرے گی۔سر سید احمد نے چندے جمع کر کے مدرسے کو ۲۴؍ مئی ۱۸۷۵ء کو شروع کروا دیا۔اب ایک مسئلہ کالج کی تعمیر کا تھا۔لیکن یہ حوصلے کا پہاڑ مسلمانوں کی کامیابی کا عزم مصمم دل میں لئے ہوئے اپنے سامنے آنے والے سارے مسائل، ساری بغاوتوں، سارے طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا اپنی کوششوں میں لگا رہا۔وہ چندہ مانگنے میں اتنا مشہور تھے کہ لوگ جہاں دیکھتے تھے یہ سوچ لیتے تھے کہ کہیں چندہ نہ مانگ لیں۔لاٹری تک ڈالی اور لوگوں کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ جب ہم اپنے لیے ناجائز کام کرتے ہیں تو قوم کی بھلائی کے لیے کیوں نہیں کر سکتے۔بھاری آواز میں غزلیں گائیں تا کہ لوگ پیسے دیں۔کتابیں فروخت کیں۔قومی رضا کار بن کر گلے میں جھولی ڈال کر پیسے جمع کیے۔یہاں تک کہ طوائفوں اور سازندوں سے بھی چندہ وصول کیا۔اتنی محنت اور جانفشانی رنگ لائی اور آخر کار یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج میں کلاسیں شروع ہو گئیں۔سرسید کے مخالفین میں سجاد حسین، اکبر الہ آبادی، امداد علی وغیرہ پیش پیش تھے۔

سرسید نے ایک کام یہ کیا کہ انھوں نے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔انھوں نے تفسیر القرآن لکھی۔جس میں اسلام کے ہر عقیدے، قانون، احکامات کو عقلی استدلال و ثبوت کے ساتھ پیش کیا لیکن وہ پوری تفسیر نہیں مکمل کر سکے اور ۲۷؍ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال فرما گئے لیکن ان کا فیض آج بھی زندہ ہے۔سرسید احمد خاں کو مولانا آزاد نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

> ''مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کایا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔''[۳]

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو اندھیروں کے بادل سے روشنی میں لا کھڑا کیا۔وہ اندھیری رات میں ایک ستارے کی مانند روشن ہوئے اور مسلمانوں پر چھائے پسماندگی، جاہلیت کے اندھیرے کو سورج بن کر روشن کر دیا۔آج بھی سرسید کی حب الوطنی، دور اندیشی، بے تعصبی اور قوم کی محبت کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''یہ سرسید کی ہستی ہی تھی، اُن کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق مل سکتے ہیں۔ان کا اپنے

نصب العین پر آخر دم تک جمے رہنا، اس کے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا، مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا، محنت ومشقت سے کبھی جی نہ چرانا، دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔ خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی ان کی زبان وقلم پر تھا۔ کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ اس سے ان کی ذات یا ان کے مقاصد کو نقصان پہنچے گا۔ ان کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے۔ جب ان پر خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی۔ اعتماد سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن انھوں نے وہی کیا جو ان کے ضمیر نے کہا۔ اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرآت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔''[۴]

سرسید احمد خاں نے اپنے ناتواں کندھوں پر پوری قوم کا بار اٹھایا اور قوم کی کامیابی کے لیے اپنے عیش وآرام، اپنے اوقات اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ ان کے بعد بھی ان کے کارنامے اور ان کا فیض زندہ ہے۔

☆ صحافت کا پہلا دور

سرسید نے صحافتی زندگی کی شروعات اپنے بھائی سید محمد خاں کے اخبار سید الاخبار سے کی تھی۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا۔ اور اس کی قیمت دو روپیہ ماہوار تھی۔ اس اخبار کے مالک سرسید کے بڑے بھائی سید محمد تھے۔ اس اخبار کی شروعات کی تاریخ میں تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق یہ اخبار ۱۸۳۷ء میں شروع ہوا تھا۔ جب کہ نادر علی خاں نے اس کا سنہ اشاعت ۱۸۴۱ء لکھا ہے۔ جب کہ جے نٹراجن نے اس بارے میں لکھا ہے۔

''سید الاخبار کا ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۷ء کے درمیان اثر کم ہونے لگا اور اس کی تعداد اشاعت ۵۰ر سے گھٹ کر ۲۷ پر آگئی۔ پہلے جہاں اس اخبار کو ۸۷ روپیہ ماہانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اب وہ گھٹ کر ۳۴ روپے پر آگئی۔ اس اخبار کی شروعات ۱۸۴۱ء میں ہوئی تھی۔ اس اخبار کو سنی مکتبہ فکر کا اخبار مانا جاتا تھا۔''[۵]

جے نٹراجن کی اس بات سے صاف ہو جاتا ہے کہ اس اخبار کی شروعات ۱۸۴۱ء میں ہی ہوئی تھی۔ سید محمد خاں چونکہ سرکاری ملازم تھے۔ اس لیے ادارت کی ذمہ داری مولوی عبدالغفور کے سپرد تھی اور اس میں زیادہ تر مضامین سرسید خود ہی لکھا کرتے تھے۔ مولانا حالی 'حیات جاوید' میں لکھتے ہیں:

''سرسید کے بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ جس سے سو روپئے ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہوگئی تھیں۔ باپ کی املاک بھی بسبب حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئی تھی۔ کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپئے ماہوار تھے اور سارے کنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے۔ لہٰذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔''[۶]

مولوی عبدالغفور صاحب قانونی داؤ پیچ میں کافی ماہر تھے۔ اسی لیے سید الاخبار میں ایسے مضامین کافی اہتمام سے شائع کیے جاتے تھے جس میں قانونی مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ یہ اخبار وکلاء میں کافی مقبول تھا۔ یہ اخبار مرزا غالب کو بے حد پسند تھا۔ محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

''غالب کے رقعات کے علاوہ مولانا حالی کی حیات جاوید اور یادگار غالب سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب اور سر سید احمد خاں میں گہرا دوستانہ تھا۔ سید محمد خاں سے بھی مرزا کو قلبی تعلق تھا اور اسی رشتے سے وہ سید الاخبار کو بھی بے حد عزیز رکھتے تھے۔''۷

مرزا غالب کے اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن سید الاخبار کے مطبع سے ہی شائع ہوا تھا اور سر سید احمد کی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید بھی ۱۸۴۷ء میں اسی مطبع سے شائع ہوئی تھی۔

سید الاخبار کو دہلی کے لوگ دم الاخوان بھی کہا کرتے تھے۔ یہی وہ اخبار تھا جس سے سر سید نے پہلی بار صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور آگے چل کر اخبار نویسی میں انھیں ایک معتبر مقام حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں محمد عتیق صدیقی کا بیان ملاحظہ ہو۔

''سید الاخبار کی اہمیت اس اعتبار سے بھی مسلم ہے کہ سید احمد خان جو آگے چل کر اردو اخبار نویسی کے نئے دور کا آغاز کرنے والے اور صاحب طرز اخبار نویس بننے والے تھے۔

ان کے لیے یہی اخبار، اخبار نویسی کا پہلا مکتب تھا۔ سر عبدالقادر مرحوم کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ سید احمد خاں نے سید الاخبار میں ''مضامین لکھ کر اپنی اخبار نویسی کی مستقل بنیاد رکھی''

سید الاخبار کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی یہ خصوصیت کافی ہے۔''۸

اس اخبار کے مضامین وکلاء، عام لوگوں کے مسائل، روزمرہ کے کام کاج کے متعلق بھی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اخبار میں فن تعمیر، مختلف تاریخی عمارات کا بھی ذکر کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے اس اخبار میں جون پور کی تاریخی عمارتوں پر لکھے مضامین ہوتے تھے۔

یہ اخبار ۱۸۴۹ء میں سر سید احمد خاں کی مصروفیت کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ جیسا کہ نادر علی خاں لکھتے ہیں:

''سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ برس کی قلیل مدت میں آثار الصنادید ایسی ضخیم، معتبر اور قابل سند کتاب کی تالیف و ترتیب بذات خود ایک زبردست کارنامہ ہے اور سر سید کی غیر معمولی مصروفیت، محنت ولیاقت کی غماز ہے۔ ایسی حالت میں دعویٰ کرنا کہ سر سید اس عرصے میں ایک ہفتہ وار اخبار کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ یقیناً صحیح نہیں ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ سید محمد خاں کا وصال ہونے کے بعد سر سید کی غیر معمولی مصروفیت اور اخبار کی طرف سے بے توجہی کے سبب سے سید الاخبار بند ہوا تھا۔''۹

سید الاخبار کے علاوہ سر سید کے مضامین اس وقت کے دوسرے اخباروں اودھ پنچ وغیرہ میں بھی شائع ہوتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اردو صحافت کو ایک نیا رخ اور نئی زمین عطا کی اور صحافت کو ایک مشن کی طرح استعمال کیا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے اس مشن کی وجہ سے صحافت کے فن سے کبھی روگردانی کی ہو۔ ان کا صحافت سے متعلق ایک تعمیری نظریہ تھا ایک خاص مقصد تھا اور اپنے اس مقصد کی تکمیل میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہوئے۔ ان کی اخبار نویسی کی بعد کے اخبار نویسوں نے تجدید کی اور اردو اخبار نویسی کو صحافت میں ایک اہم مقام عطا کیا۔

ہفتہ وار اخبار رفیق ہند لاہور جو ۵ر جنوری ۱۸۸۴ء کو شروع ہوا تھا۔ اس اخبار کی پہلی اشاعت میں سر سید احمد خاں کا ایک مضمون ''اخبارات کیسے ہونے چاہئیں'' شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کو مولوی محرم علی چشتی نے شروع کیا تھا۔ یہ مولوی صاحب بعد میں سر سید کے کٹر مخالف بن گئے تھے، لیکن انہوں نے اپنے اخبار کی شروعات سر سید کے مضمون سے کی تھی۔ یہ مضمون اداریے کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید کے پاس اس زمانے میں بھی اخبار نویسی کا جواز موجود تھا اور ایک اہم مقصد کی تکمیل اور وقت کی ضرورت نے اخبار نویسی کی طرف انہیں مائل کیا تھا۔ میں یہاں پر وہ مضمون اور مولوی محرم علی کی تمہید پیش کر رہا ہوں۔

''ہمارے آنریبل قبلہ عالی جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی نے ''رفیق ہند'' کے جاری ہونے کا حال معلوم کر کے براہ مرحمت بزرگانہ ہمیں مندرجہ ذیل مضمون عطا فرمایا ہے۔ جس کے اندراج سے ہم سب سے پہلے تیمناً اپنے ایڈیٹوریل کالموں کو منتخر کرتے ہیں۔ جس سچی اور دلی شفقت سے جناب ممدوح نے اس پرچہ کے ناچیز ایڈیٹر کی نسبت اپنا بزرگانہ حسن ظن ظاہر فرمایا ہے اور خاتمہ مضمون پر جس موثر طور سے اس کے لیے دعا کی ہے۔ ہم اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور یقین واثق کرتے ہیں کہ یہ ہیچمیرز پرچا اپنے محسن مولانا کی سرپرستی اورنگرانی اور مستقل امداد سے ان مراقب کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکے گا جو براہ قومی ہمدردی اُن کے ملحوظ خاطر رہے ہیں۔ تاکہ جس طرح جناب ممدوح نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس پرچہ کا فاؤنڈیشن سٹون (بنیادی پتھر) رکھا ہے۔ یہ بھی ہمیشہ اس قابل یادگار عزت کو خوبی سے قائم رکھ سکے اور انکی برکت سے خداوند کریم اُس کی عمر اور کارروائیوں میں بھی برکت دے۔ (محرم علی چشتی)

کہتے ہیں اخبار ایک نہایت عمدہ ذریعہ قومی ترقی، ملکی بھلائی، عوام کی رہنمائی، خواص کی دلچسپی، حکام کی ہدایت اور رعایا کی اطاعت کا ہے۔ مگر اس کے دوسرے پہلو پر نظر کمتر کی جاتی ہے۔ اخبار جیسا ذریعہ ان بھلائیوں کا ہے ویسا ہی ذریعہ بہت سی برائیوں کا بھی ہے بلکہ افسوس ہے کہ ہمارا ملک ابھی پہلی قسم کے اخباروں کا نہایت محتاج ہے۔ ایسے اخباروں کی کمی سے اور زیادہ تر اخباروں کے پڑھنے والوں کے نہ ہونے سے ملک میں جہالت و ناخواندگی اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ کسی شہر و قصبہ میں فی صدی پانچ آدمی بھی اخبار پڑھنے کے لائق نہ نکلیں گے اور جو نکلیں گے وہ اخبار پڑھنے کو تضیع اوقات اور حرکت بے سود سمجھیں گے۔

ہندوستان کے رہنے والوں کو پولیٹیکل امور سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ سوشل حالت کی ان کو پرواہ نہیں ہے۔ پھر اخبار پڑھنا تضیع اوقات نہ سمجھیں تو اور کیا سمجھیں؟ روپیہ بلاشبہ سب سے مقدم چیز ہے۔ کوئی کام ہو اور کیسا ہی مفید ہو۔ اگر اس کام کے کرنے والے کو روپے کی طرف سے بے فکری نہ ہو تو نہ کام کر سکتا ہے اور نہ وہ کام چل سکتا ہے۔ اخبار کا کارخانہ بھی اس قاعدہ کلیہ سے خالی نہیں ہے۔ مگر شائستہ اور ناشائستہ یا مہذب و نامہذب ملک میں اس کے برتاؤ میں فرق ہے۔ تربیت یافتہ ملک میں ایسے کام جن کو عام لوگوں سے تعلق ہے۔ عام لوگوں کے فائدے کی غرض سے کیے جاتے ہیں جس میں روپیہ کا ذاتی فائدہ بھی حاصل ہو۔ (مگر) نامہذب ملک میں کسی ایسے امر کا جس سے عام لوگوں کو مضرت پہنچے۔ بہ شرطیکہ اس سے روپیہ کا ذاتی فائدہ ہو کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔

اس پچھلی بدخصلت کے ظاہر ہونے کا بھی اخبار ایک عمدہ ذریعہ ہے وہ اپنے کالموں میں ایسی خبروں کو جگہ دیتا ہے جو لوگوں کے ان ذاتی اخلاق و عادات سے تعلق رکھتی ہیں جن کو پبلک سے کچھ تعلق نہیں۔ کبھی وہ ان کے اوصاف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے اور کبھی ان کی ہجو میں انشاپردازی اور عبارت آرائی کے جوہر دکھاتا ہے۔ اخبار کے خریدنے والوں کا مداح اور انکار کرنے والوں کا ہائے ہوز سے ہاجی بنتا ہے۔ سنی ہوئی خبر ہیں۔ عہدہ داروں اور اہل کاروں کی نسبت چھاپتا ہے جو ایسے امور سے متعلق ہیں جن کا فیصلہ ایک جج کے بغیر نہیں ہو سکتا اور غلطی سے اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ میں نے نہایت رفاہ خلائق کا کام کیا ہے۔ لوگوں کے خوش کرنے اور اخبار کے خریدار بڑھانے کو ایسے مضامین اور

اشتہارات چھاپتا ہے جو پبلک کے اخلاق پرنہایت بداثر پیدا کرتے ہیں۔غرض کہ اخبار ایک ایسی چیز ہے کہ خود آپ میں اپنی خصلت کا آئینہ ہے۔کسی نے خوب کہا ہے ۔

کھلتا کسی پہ کا ہے کو دل کا معاملہ

خبروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ہمارے ملک کے اخباروں میں پنجاب کے اخبار بلاشبہ سب سے عمدہ ہیں۔ میں ان کو منزہ عن الخطا تو نہیں کہتا مگر اعلی اور عمدہ کہتا ہوں۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ ان عمدہ اخباروں میں ایک اور اخبار ''رفیق ہند'' (کا) اضافہ ہوتا ہے۔جس کی نسبت توقع ہے کہ نیوا یرز ڈے (سال کے پہلے دن) کو نیا پیدا ہونے والا ہے۔ ہمارے شفیق مولوی محرم علی چشتی جن کی ذہانت، جودت طبع، تیزی خیالات اور ہمدردی قومی مشہور ومعروف ہے اس اخبار کو نکالتے ہیں۔ہم کو خدا سے امید ہے کہ وہ اخبار ان تمام صفتوں کے ساتھ سلیم الطبع اور متحمل المزاج بھی ہوگا اور جس قدر ممکن ہے ملک کو فائدہ پہنچائے گا۔اور خدا! تو ایسا ہی کر!! آمین!!!۔'' ١٠ (راقم۔سید احمد۔مقام علی گڑھ)

یہ اقتباس طویل ہو گیا ہے لیکن اسے پورا لکھنا اس لیے ضروری تھا کہ اس مضمون سے سرسید احمد خاں کا صحافتی نظریہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔سرسید احمد خاں کے خیال میں صحافی کو قوم کا ناصح ہونا چاہیے اسے روزمرہ کے حالات، ملکی وغیر ملکی مسائل کی مکمل جانکاری ہونی چاہیے۔تبھی وہ صحافت کے میدان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ ڈیوڈوین رائٹ اپنی کتاب جرنلز میں لکھتے ہیں:

> "The first duty of press is to obtain the earliest and most collect intelligence of the events of the time, and instantly by disclosing them, to make them the common property of the nation." (The Times 1852)
>
> It is news paper's duty to point the news and raise hell. (Chicago times, 1861). 11

انہیں باتوں کو امداد صابری اپنے انداز میں لکھتے ہیں:

''ایک صحافی مورخ و ناقد کی حیثیت رکھتا ہے۔وہ مورخ ہی نہیں بلکہ قوم و ملک کے خیالات و حالات، اور ماحول کو بنانے اور سدھارنے، بدلنے اور بگاڑنے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔'' ١٢

اس زمانے میں جب کہ آج کی طرح نہ تو جدید مشینیں مہیا تھیں اور نہ ہی اخبار کے لیے رپورٹر ہوتے تھے۔سرسید احمد خاں نے اردو صحافت کو صحافت کی کسوٹی پر پورا اتارا اور اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔مندرجہ بالا مضمون یہ ظاہر کرتا ہے کہ سرسید احمد کو صحافت کے فن کی پوری واقفیت تھی اور ایک پورا اصول تھا جس پر عمل کر کے انھوں نے صحافتی مشن کو آگے بڑھایا۔

اداریہ نویسی کا آغاز بھی سرسید احمد خان نے ہی شروع کیا تھا۔ بامقصد اور نظریاتی صحافت کو اپنا دستور العمل بنایا۔ ٹائپ کی شروعات کی۔خبر نگاری اور صحافت کے جدید اصولوں کو فروغ دیا۔سید احمد قادری لکھتے ہیں

''سرسید نے یقینی طور پر اردو صحافت کے معیار، وقار اور اعتبار کو بڑھایا اور اردو صحافت کو نئی تکنیک اور

اسلوب سے متعارف کروایا۔ سرسید اخبار کی آزادی کے ہم نوا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صحافتی آزادی کے بغیر لوگ اپنے اظہار وخیال میں وسعت پیدا نہیں کر سکتے۔ اسی لیے بے باک اور بے لاگ اظہار خیال کی تائید کرتے ہوئے صحافت کی آزادی پر اس انداز سے زور دیا۔''۱۳

سرسید احمد خان اس سلسلے میں خود ہی لکھتے ہیں

''سب سے پہلے اول شرط یہ ہے کہ گورنمنٹ چھاپے خانوں یعنی اخباروں کی آزادی کو ملک کے اصول حکمرانی میں تسلیم کرے اور جو مزاحمتیں اخبار کی آزادی کے خلاف ہوں ان کو جائز سمجھے۔''۱۴

سرسید احمد خاں نے ایسے پرآشوب دور میں جب مسلمانوں پر ہر طرف سے زوال آیا ہوا تھا۔قوم کے نشیمن کی تعمیر کا خواب دیکھا تھا اور اپنے صحافتی کاموں سے اپنی تحریک سے اسے پورا بھی کیا۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

''سرسید کی صحافت میں دو باتیں بڑی چمک اور تابانی رکھتی ہیں۔اول ان کے صحائف کی دیدہ زیبی ،ٹائپ کا حسن اور کاغذ کی عمدگی۔اس لحاظ سے ان کے اخبار موجودہ ترقی یافتہ یورپ کے اعلیٰ اخباروں اور رسالوں سے کسی طرح کم نہیں۔ دوم ان اخبارات کی معقولیت۔اخبارات میں واقعات ومعاملات پر بے لاگ رائے جس میں بڑی عاقبت بینی ،وسعت معلومات اور تعمیری نقطہ نظر جھلکتا ہے۔یہی ان کے تبصروں کی خصوصیت ہے اور مضامین علمی میں سرسید کی مخصوص معقول اسپرٹ اور حیات قومی کی تشکیل جدید اور زندگی کی تمدنی اساس کا پورا پورا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ عقلی اور تجزیاتی اصول صحافت سرسید کی اخبار نویسی کے خاتمے کے بعد آج تک اردو اخبار نویسی میں پیدا نہ ہو سکا۔''۱۵

سرسید نے انہیں اصولوں پر کار بند رہ کر صحافت میں اپنا ایک رخ متعین کیا اور آج بھی کتنے ہی اخبار نویس سرسید کے اصولوں پر کار بند ہو کر اردو صحافت کے میدان میں پرچم بلند کر رہے ہیں۔

☆ صحافت کا دوسرا دور

سرسید کی صحافت کے دوسرے دور کو ہم دور زریں یا ان کی صحافت کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔سرسید پہلے بھائی کے اخبار میں طبع آزمائی کر رہے تھے اور دوسرے اخبارات میں لکھ رہے تھے لیکن پھر انھوں نے اپنا اخبار شروع کیا اور صحافت کے میدان میں اپنی فتح کا نشان لہرا دیا۔ان کی اخبار نویسی نے بعد میں اخباروں کو صحافت کے رخ متعین کرنے میں بھی مدد دی۔ اس سلسلے مین منظر اعظمی لکھتے ہیں:

''سرسید کے اخبارات کے خیالات اور اثرات بیسویں صدی میں الہلال، ہمدرد، مخزن اور زمیندار میں بھی نمایاں رہے۔اودھ پنچ، اودھ اخبار اور پیسہ اخبار نے بھی انھیں اخبارات سے کسب فیض کیا اور بعد میں وطن لاہور، وکیل امرتسر، ہمدم لکھنؤ، آزاد کانپور، اتحاد پٹنہ اور سوراجیہ الہ آباد اہم اخبار ات تھے۔جنھوں نے سرسید کی آزادی رائے اور آزادی صحافت کے اصولوں پر بڑی حد تک عمل کیا۔ اگرچہ اس عہد میں حالات دوسرے تھے اور سیاست کی گہما گہمی نے صحافت سے متانت اور ادبیت کے عناصر کم کر دیئے تھے۔مگر سرسید نے صحافت میں جو معیار قائم کیا تھا اس کو بیشتر اخبارات نے پیش نظر رکھا۔''۱۶

۱۸۵۷ء کی بغاوت نے مسلمانوں کو جاہلیت اور پسماندگی کے پرآشوب دور میں لاکھڑا کیا تھا اور مسلمان اس تباہی سے نکل نہیں پا رہے تھے۔اس وقت ایسے حالات بن چکے تھے جب کہ انگریز مسلمانوں کو ہی اس بغاوت کا ذمہ دار سمجھ رہے

تھے۔ایسی حالت میں سرسید ایسا مردِ مجاہد کھڑا ہوتا ہے اور انگریزوں کے سامنے صفائی پیش کرتا ہے کہ مسلمان اس بغاوت کے ذمہ دار نہیں تھے۔

سرسید نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا اور انگریزوں کو بغاوت کی وجوہات بتانے کی کوشش کی۔ چپاتیوں کی تقسیم، روس وایران گٹھ جوڑ، حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش، ان سب معاملوں کے تعلق سے انگریزوں کے خیالات میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔اس بات کو بھی غلط ثابت کیا کہ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور اس سلسلے میں باغیوں کا جو جہاد کا فتویٰ چھپا تھا وہ بھی غلط تھا۔سرسید نے اپنی مثال دی اور کہا کہ میں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھی انگریز حاکموں کی ساری رات پہرے داری کی۔ان سب باتوں کے علاوہ سرسید نے فساد کے اصل سبب کو سامنے لانے کی کوشش کی۔اس بارے میں عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''ان سب وجوہ کے بیان کے بعد سرسید نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فساد کا اصل سبب یہ تھا کہ لجس لیٹو کونسل میں ہندوستانی نہیں لیے گئے اور اس طرح انگریز حکمراں ہندوستانیوں کے جذبات واحساسات سے کاملاً بے خبر رہے۔آپ نے سرکشی کی پانچ وجوہ بتائیں۔

اول:۔رعایا کی غلط فہمی، یعنی رعایا نے حکومت کی تجاویز کا مطلب غلط سمجھا

دوم:۔حکومت نے ایسے آئین وضوابط جاری کیے جو ہندوستانیوں کی عادات کے مطابق نہیں تھا۔

سوم:۔حکومت رعایا کے اصل حالات اور مصائب سے ناواقف رہی۔

چہارم:۔حکومت نے بعض ایسی باتیں ترک کردیں۔جن کی موجودگی ضروری تھی۔

پنجم:۔فوج کی بدانتظامی

آپ نے لکھا کہ مسلمانوں کو یہ باتیں زیادہ ناگوار تھیں۔کیوں کہ حکمرانی کے زوال پر ان کی بے شمار مراعات چھین لی گئی تھیں۔'' ۱۷

ان وجوہات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان کسی بھی طرح اس بغاوت کے ذمہ دار نہیں تھے۔اس رسالے کے لکھنے کے بعد سرسید نے ہمت وجرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ولایت بھی بھیجا اور ہندوستانی حکومت کو بھی اسکی کاپیاں روانہ کیں۔اس سلسلے میں ایک واقعہ رقم کرنا بہتر ہوگا۔رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر اس کی کاپیاں نہ صرف ولایت بھیجیں بلکہ اس کی ایک کاپی گورنمنٹ آف انڈیا کو ارسال کردی۔اس موقع پر سرسید کے ایک ہندو دوست رائے شنکر داس نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے منع کیا تھا کہ:

ان تمام کتابوں کو جلا دو، خواہ مخواہ اپنی جان کو کیوں خطرے میں ڈال رہے ہو۔

اس پر سرسید نے جو جواب دیا وہ ان کی بے تعصبی اور وسیع القلبی کی ایک روشن دلیل ہے۔انھوں نے کہا کہ:

''میں ان تمام باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں۔پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کوئی گزند بھی پہنچے تو گوارہ ہے۔'' ۱۸

سرسید کی یہ پہلی ایسی کوشش تھی جسے ہم انگریزوں کے سامنے ایک علم بغاوت کا نام دے سکتے ہیں۔سرسید نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ اس رسالے کے دوررس نتائج برآمد نہیں ہونگے اور اس طرح کے الزامات لگتے ہی رہیں گے۔اس لیے اس سمت میں ایک ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔انھوں نے اس بات پر پوری تحقیق کی کہ آخر مسلمانوں پر الزام کیوں لگائے گئے اور جو نتائج انھیں حاصل ہوئے وہ مسلمانوں کی حالت زار کی کہانی بیان کررہے تھے۔اس حالت کو بدلنے کے لیے اب ایک ہتھیار کی ضرورت تھی۔عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''اس صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے سرسید میدان عمل میں داخل ہوئے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بغض کو دور کر کے خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں۔مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم سے آشنا کیا جائے۔تاکہ ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھلیں اور ایسا نہ ہو کہ وہ سیاسی اچھوت بن کر رہ جائیں۔سوچنے،سمجھنے والے طبقے تک پہنچنے کے لیے اس وقت صحافت ہی واحد ذریعہ تھی۔اس لیے سرسید نے اس ذریعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تحریک خوب بڑھی اور پھلی پھولی اور اس کی گونج سارے برعظیم میں سنائی دینے لگی۔''۱۹

☆ سائنٹفک سوسائٹی

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی پسماندگی اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایک منظّم تحریک یا مشن کی شکل میں کوشش نہ کی جائے۔اور ایسا کرنے کے لیے عوام کے خیالات میں، ان کے احساسات میں تبدیلی لانا لازمی ہے۔ان کا عقیدہ تھا کہ نئے خیالات اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہی توہم پرستی اور جہالت کے اندھیرے سے باہر نکلا جاسکتا ہے۔مسلمانوں پر چھائے ہوئے پسماندگی کے گہرے کہرے کو دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک انجمن قائم کی جائے۔چنانچہ انہیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی شروعات کی۔اس سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۹ رجنوری کو غازی پور میں ہوا تھا۔جلسے کا انعقاد سرسید نے اپنے ہی مکان پر کیا تھا۔اس بارے میں انھوں نے ایک تحریر ''التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب تعلیم اہل ہند'' میں بھی اشارہ کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ عملی اقدامات کیے جائیں۔

دنیا کے اس دور میں جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے کہ جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے.......

''ایسی بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالنی اور ہمارے ہم وطنوں، ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا۔تجویز ہوتا ہے۔جس کا مقصود یہ ہوگا۔اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفوں کے بہت عمدہ کتابوں کا، دوسرے انگریزی زبان سے اور زبانوں سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرانا اور چھاپنا جو سب کے لیے مفید ہوں۔''۲۰

اسی سال جب وہ غازی پور سے علی گڑھ آئے تو سائنٹفک سوسائٹی بھی ان کے ساتھ ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ہندوستان میں اس وقت کے پرآشوب دور میں ایک تنظیم قائم کرنا اور وہ بھی ایسی تنظیم جو تمام جدید اصولوں اور سائنٹفک قانونوں پر منحصر ہو۔جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں۔

''اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ نہ صرف نئے نئے کام سوچتا تھا بلکہ ان کاموں کی تکمیل کے لیے اسے لوگوں کو قائل کرنا بھی خوب آتا تھا۔وہ سوسائٹی کا سامان لے کر علی گڑھ میں داخل ہوا تھا۔اس کی عمارت لے کر نہیں لیکن اس نے یہاں پہنچتے ہی فیاض ہمدردوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔تیس ہزار کی لاگت سے ایک عالیشان عمارت، دل کشا چمن اور وسیع احاطہ سائنٹفک سوسائٹی کے دفتر کی شکل میں ڈھل گیا۔''۲۱

اس تنظیم کا مقصد نہایت ہی اعلیٰ تھا جس میں اپنی کوئی بھی غرض چھپی ہوئی نہیں تھی۔

'ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان یا دوسری غیر ملکی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہندوستانی نہیں پڑھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرانا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔ایشیا کے قدیم

مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کی تلاش کر ترجمہ بہم پہنچانا اور چھاپنا۔ سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہیں ہوگا۔''۲۲

سرسید نے اپنی کوششوں سے سوسائٹی کو کامیاب بنایا ہر مہینہ جلسوں کا اہتمام کرنا، مضامین جن پر لکچر ہوتے تھے۔ وہ خاص طور سے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے ہوتے تھے۔ سائنس کے موضوع پر لکچر کے لیے ایک انگریز ڈاکٹر متعین کیے گئے تھے۔ ایک پورا عملہ تھا جو سوسائٹی کا کام کرتا تھا۔ مترجم، مولوی، پریس مین، چپراسی، مالی وغیرہ اور انھیں باضابطہ تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں۔

''سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دارومدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے متبین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی اور اردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے۔ جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دے دیا۔''۲۳

سوسائٹی سے تاریخ، فلسفہ، سائنس، یورپ کے آلات کاشتکاری، تاریخ چین، جیالوجی، تاریخ ایران، تاریخ بھوپال، تاریخ اسپین، علم طبیعات، سنسکرت، علم جہاز رانی، رسالہ درباب سڑک، ریل وغیرہ۔ اس وقت کی مشہور کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اصغر عباس کے مطابق سوسائٹی سے صرف ۱۵ کتابیں ہی شائع ہوئیں۔ جب کہ مولوی عبدالحق چالیس کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔۲۴

۱۴ر فروری ۱۸۶۶ء کو سوسائٹی کے اخبار کی شروعات ہوئی۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا لیکن بعد میں ہفتے میں دو بار نکلنے لگا۔ اس اخبار کا اداریہ سرسید خود ہی لکھا کرتے تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں ایک نیا تعمیری نظریہ پیش کیا۔ اس اخبار میں سوشل، اخلاقی، علمی اور سیاسی ہر طرح کے مضامین چھپتے تھے۔ ساتھ ہی خبروں کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔

۱۵ر اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید کا علی گڑھ سے بنارس تبادلہ ہو گیا تھا۔ ان کے بنارس جانے کے بعد سائنٹفک سوسائٹی کی ذمہ داری کا بوجھ راجہ جے کشن داس نے اٹھایا۔ اور راجہ صاحب نے سوسائٹی کے تصنیف و تالیف کے کاموں کو بڑی حد تک جاری رکھا۔ بعد میں سرسید جب لندن چلے گئے تب بھی انھوں نے سوسائٹی کی ہمیشہ خبرگیری کی اور اس کی سرگرمیوں میں پوری طرح ساتھ دیتے رہے بلکہ لندن سے بھی انہوں نے کئی کتابیں ہندوستان بھیجیں تا کہ سوسائٹی ان کتابوں کا ترجمہ کرے۔

۲۱ر فروری ۱۸۷۴ء کو راجہ جے کشن داس الہ آباد چلے گئے۔ ان کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں نے اس کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان کی سبکدوشی کے بعد مولوی زین العابدین اور پنڈت رادھا کشن کو سوسائٹی کا سکریٹری بنایا گیا۔ ۲۵ر اگست ۱۸۷۴ء کو مولوی سمیع اللہ خاں نے دوبارہ سے سوسائٹی کی دیکھ ریکھ شروع کر دی۔ ۲ر مئی ۱۸۷۷ء تک مولوی سمیع اللہ خاں اور پنڈت رادھا کشن دونوں ہی اس کے سکریٹری رہے۔ سرسید بھی علی گڑھ واپس آ چکے تھے اور سوسائٹی کے کاموں میں پہلے ہی جیسے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ناظم اعلیٰ کا عہدہ سرسید کے سپرد تھا۔ اس وقت سوسائٹی پر قرض بھی کافی چڑھ چکا تھا۔ سرسید نے سوسائٹی کو پھر سے روبہ صحت کرنے کے لیے ۲۶ر ستمبر ۱۸۷۸ء کو سوسائٹی کے قاعدوں میں تبدیلی کی، لیکن سوسائٹی کی خستہ حالی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۱۸۷۸ء میں سرسید کے ممبر کونسل چنے جانے کے بعد خواجہ محمد یوسف کو سوسائٹی کا سکریٹری بنایا گیا۔ دھیرے دھیرے سوسائٹی کی حالت اور بھی خراب ہوتی چلی گئی۔ ممبران کی تعداد بھی گھٹ گئی تھی اور بالکل نہیں کے برابر ہوگئی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں سوسائٹی صرف تین ممبران پر مشتمل تھی۔ آخر کار سوسائٹی کو ۱۰ر جولائی ۱۸۸۷ء کو مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ہی شامل کر دیا گیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں عبدالحق لکھتے ہیں:

''اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوگئیں۔ جو اپنے اپنے حلقہ میں مفید کام کرتی تھیں۔ سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی اور معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے۔''۲۵

سوسائٹی کی علمی اور ادبی کاوشوں پر مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں۔

''قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس سے اور بھی بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو۔ اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔ پھر ۲۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اس کے بعد اسی کی ریس میں قائم ہوئیں۔''۲۶

سر سید احمد خاں نے تین کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ مذہب کی تشریح نو، سماجی اصلاح اور تعلیمی پسماندگی دور کرنا، انھوں نے تعلیمی آزادی کو عام کرنے کی کوشش کی، اور اپنے ان کاموں کو انجام دینے کے لیے سوسائٹی اور اپنے اخبار کا سہارا لیا۔ انھوں نے پورے ملک کے لوگوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

''اس سوسائٹی کے قیام سے یہاں سوچنے کے انداز، اظہار کے نئے اسالیب اور عمل کے نئے طریقوں کا در بار ہوا۔ یہی وہ سوسائٹی تھی جس نے مغرب کی لائی ہوئی برکتوں سے ہم آہنگ کرنے اور خواص طور سے شمالی ہند میں ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے میں اہم رول ادا کیا۔

سوسائٹی کا طریق کار سیکولر تھا اور اسی انجمن میں ہندو مسلم اور انگریز ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر دوبدو ہوئے اور اس کے ذریعہ باہمی افہام و تفہیم کی فضا ساز گار ہوئی۔''۲۷

ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان تعطل کا شکار تھا۔ ملک میں نہ تو کوئی رہبر تھا اور نہ ہی کسی کو ان باتوں کی فکر تھی۔ ایسے وقت میں جب کہ عوام کی بے بسی اور بے کسی دنوں دن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ سر سید احمد نے ایسے وقت میں ایک سر سبز و شاداب گلشن کا خواب دیکھا اور اسے پورا کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ جس علی گڑھ تحریک نے ملک میں ایک تعلیمی مہم چھیڑ دی تھی اس کی شروعات سوسائٹی کی علمی کاوشوں سے ہی ہوئی تھی۔ علی گڑھ تحریک کا تذکرہ ہو اور سوسائٹی زیر بحث نہ آئے ایسا ہو نہیں سکتا۔

سر سید نے جتنی کتابوں کو ترجمہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا اگر وہ ساری ترجمہ ہو جاتیں تو ہندوستانیوں کو اپنی زبان میں مغرب کے بیش بہا خزانے میسر ہو جاتے اور ہندوستانی زبان اور بھی امیر ہو جاتی۔ ان کے بعد مولوی ذکاءاللہ نے بھی اس سلسلے میں کام کیے اور مختلف کتابوں کا ہندوستانی میں ترجمہ کرایا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت میں سوسائٹی کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔

☆ اخبار سائنٹفک سوسائٹی

ہندوستان میں ۱۸۲۲ء سے اردو صحافت کی شروعات ہوتی ہے۔ اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک اردو صحافت ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ اس سفر میں رام موہن رائے، مولوی باقر، سید محمد خاں، ماسٹر رام چندر، منشی نول کشور جیسے لوگوں نے صحافت کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ لیکن اب بھی اردو صحافت کا ایک سیدھا رخ متعین نہیں ہوا تھا۔ صحافت کا

مقصد ابھی تک پوری طرح سے واضح نہیں تھا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے اخبار سائنٹفک سوسائٹی سے اردو صحافت میں ایک نئی شروعات کی اور اپنی صحافت کا ایک معیار، ایک نصب العین بنایا جس سے اردو زبان وادب، قوم وملک، معاشرے اور صحافت کے جہاں میں بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بقول اصغر عباس۔

''جام جہاں نما سے لے کر آج کے اردو اخباروں تک اردو صحافت نے ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہیں۔ لیکن گزٹ نے اردو صحافت میں جو اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا ذکر اردو صحافت کے مورخ کے لیے ناگزیر ہوگا۔ یہی وہ اخبار ہے جس نے صحافت کو آزادی رائے، سنجیدگی، متانت اور صحت واقعات کی خوبیوں سے نوازا اور باوقار صحافت کی بنیاد ڈالی۔ یہی وہ نظریاتی اخبار ہے جس کے مقاصد کو بڑے پیمانے پر قبولیت حاصل ہوئی۔ اس اخبار نے ان ادیبوں کی تربیت کی جن کے کارناموں کی یاد ہمارے ادب کی منزل مقصود ہے۔'' ۲۸

سرسید کا خیال تھا کہ انگریزی حکومت کئی خصوصیات اور کئی صفات کی حامل ہے۔ ان صفات کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اور انگریزی تعلیم اور نئے خیالات کو عام کرنے کے لیے انھوں نے اس اخبار کو شروع کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ پہلا اخبار تھا جس نے آزادی کے ساتھ اظہار رائے کیا۔

۳۰/ مارچ ۱۸۶۶ء کا دن اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے جاری ہونے کا پہلا دن تھا۔ اخبار کے پہلے ورق پر اردو میں سائنٹفک سوسائٹی اور نیم دائرے میں The Aligarh Institute Gazatte چھپا ہوتا تھا۔ اخبار کے نام کے بعد انگریزی اور اردو میں اخبار کا ماٹو چھپا ہوتا تھا۔

''آزادی چھاپہ کی ہے۔ ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا''۔

بعد میں اس سطر کو تھوڑا تبدیل کر کے اس طرح سے کر دیا گیا۔

''جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا کام ایک آزاد رعیت کا''۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ غیر ملکی حکومت نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو بڑی مشکلوں سے دبایا تھا اور ملک میں ایک خوف ودہشت کی فضا بن گئی تھی۔ اس حالت میں اس طرح کا مالؤ اور حکومت کی کوتاہیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کرنا بڑی جواں مردی کا کام تھا۔ یہیں سرسید دوسرے صحافیوں سے آگے نظر آتے ہیں۔

''گو مطابع کی آزادی کی آواز قدیم ''کوہ نور'' میں بھی سنی گئی تھی۔ لیکن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پہلا اخبار تھا جس نے اپنے سرورق کو اس کے اعلان سے ذہنیت بخشی۔

دراصل انسٹی ٹیوٹ گزٹ اردو میں قدیم اور جدید صحافت کے درمیان کی وہ کڑی ہے جس نے اردو صحافت کو نیا وقار دیا۔'' ۲۹

اخبار کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا۔

یہ اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ سے ہفتہ وار جاری ہوتا ہے۔ قیمت اس کی حسب تفصیل ذیل ہے مگر جو لوگ سین ٹیفک سوسائٹی کے ممبر ہیں ان کو بلا قیمت ملتا ہے۔ سالانہ قیمت اخبار۔۱۲/روپیہ۔ سالانہ محصول۔۳ روپیہ۔

جو ممبر ہماری سوسائٹی کے علی گڑھ کے رہنے والے ہیں۔ ان کو چوبیس روپیہ سالانہ اور جو باہر کے رہنے والے ہیں ان کو محصول اخبار سینتیس روپیہ سالانہ دینا پڑتا ہے، اور کل کتابیں اور اخبار جو سوسائٹی چھاپتی

ہے وہ بلا قیمت ان کو ملتے ہیں۔''۳۰

کافی دنوں تک یہ اخبار ہفتے وار ہی نکلتا رہا لیکن بعد میں یہ سہ روزہ ہوگیا۔ اخبار کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک کالم اردو میں ہوتا تھا۔ بعض مضامین اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیے جاتے تھے۔ سرسید احمد کا منشا یہ تھا کہ ملک کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے کے زیادہ سے قریب آئیں اور باہمی افہام و تفہیم کا سلسلہ دراز ہو۔

دس سالوں کے بعد اخبار میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ ستمبر ۱۸۷۶ء میں راجہ جگت سنگھ نے اپنا پریس اور انگریزی اخبار ''پروگرس'' سائنٹفک سوسائٹی کو سونپ دیا تو اردو میں ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ جس میں اخبار پروگرس مل گیا ہے'' لکھا جانے لگا۔ لیکن جون ۱۸۷۷ء میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اس کا نام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کردیا گیا اور قارئین کی اطلاع کے لیے لکھا جانے لگا۔ ''جس میں اخبار پروگرس مل گیا ہے''۔

یہ اخبار سولہ صفحات کا ہوتا تھا اور جمعہ کا دن اس کی اشاعت کے لیے مقرر تھا۔ لیکن ہفتے میں دوبار ہونے کے بعد ایک سنیچر کو اور دوسرا منگل کو نکلنے لگا۔ منگل والا اخبار ۱۲ صفحے کا ہوتا تھا۔ سرسید خود ہی لکھتے ہیں۔

> ''واضح ہو کہ جو اخبار بروز شنبہ کو نکلتا ہے اس کی مقدار آٹھ ورق یعنی سولہ صفحہ کی ہے۔ اس میں چھ ورق یعنی بارہ صفحہ اخبار سے متعلق ہیں اور دو ورق اشتہارات کے لیے ہیں، لیکن اگر اشتہارات دو ورق سے کم ہوں یا نہ ہوں تو ان میں بھی اخبار یا مضامین چھاپ دیے جاتے ہیں۔ جو اخبار کہ بروز سہ شنبہ نکلتا ہے اس کی مقدار چھ ورق یعنی بارہ صفحہ ہیں۔ اس میں دو ورق واسطے اشتہارات کے موضوع ہیں مگر بہ حالت نہ ہونے یا کم ہونے اشتہارات کے، ان میں بھی مضامین یا خبر چھاپ دیتے ہیں۔ اگر اشتہارات دو ورق سے زیادہ ہوتے ہیں تو مقدار صفحوں کی زیادہ بڑھادی جاتی ہے۔ مگر جس قدر صفحات کہ مضامین کے لیے متعین ہیں۔ ان میں کبھی کمی نہیں ہونے پاتی۔''۳۱

کافی عرصے تک یہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی سے ہی نکلتا رہا لیکن جب بعد میں سوسائٹی مالی طور پر کمزور ہوگئی تو جولائی ۱۸۸۷ء سے مدرستہ العلوم کی مجلس انتظامیہ نے اس کا بار اٹھانا شروع کیا۔ اخبار کی ادارت کے فرائض مختلف وقتوں میں مختلف لوگوں نے انجام دیے لیکن حقیقت یہ تھی کہ سرسید ہی اس کی اصل روح رواں تھے۔ ایڈیٹر کا کام یہ تھا کہ جو کچھ بھی شائع ہونا ہے اسے درست کرے اور چھاپہ خانے تک جانے اور چھپ کر آنے تک کی ذمہ داری لے۔ ایڈیٹر کو اس کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ سرسید کے حکم کے خلاف کوئی خبر روک لے یا کوئی خبر شائع کردے۔ ملاحظہ ہو۔

> ''اردو اخبار کے ایڈیٹر کا کام یہ ہے کہ خبروں کو منتخب کرکے جو خبریں قابل درج کرنے کے ہیں۔ ان کو درج کرنا اور جو ترجمہ انگریزی مترجموں نے کیا ہو، اس کو از سرنو عمدہ عبارت میں درست کرکے اخبار میں لکھنا، اس لیے اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ کوئی کاپی جس کو اس نے صرف کرش کردیا ہو چھپنے کے لیے چھاپہ خانہ میں نہ جاوے بلکہ کاپیاں جن کو ایڈیٹر نے اپنے ہاتھ سے درست کیا ہو۔ اسے چھپنے کے چھاپہ خانہ میں جاویں۔''۳۲

یہاں یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ سرسید سرکاری ملازمت میں تھے اس لیے ان کا نام بطور ایڈیٹر شائع بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس بارے میں حالی لکھتے ہیں۔

> ''اس اخبار کے ایڈیٹوریل کا اہتمام ابتدا سے اخیر تک سوائے ان ایام کے جب سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے۔ انہیں کے ہاتھ میں رہا۔''۳۳

اخبار کے پہلے ایڈیٹر محمد یار خاں تھے۔ ان کے بعد مولوی اسمٰعیل کے ذمہ ادارت سونپی گئی۔ مئی ۱۸۷۷ء میں سرسید

جب علی گڑھ آ گئے تو وہ گزٹ کے اعزازی ایڈیٹر ہو گئے۔ بعد میں ۱۸۷۸ء میں انھوں نے یہ ذمہ داری چھوڑ دی۔ اس کے بعد بابو درگا پرشاد، خواجہ محمد یوسف اور مولوی سمیع اللہ خاں نے گزٹ کی ادارت کی۔ ساتھ ہی ساتھ سرسید بھی اخبار میں مضامین، اداریے اور خبروں پر کافی گہرائی سے نظر ثانی کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں تہذیب الاخلاق کو بھی گزٹ میں شامل کرلیا گیا۔ سرسید خود ہی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''تہذیب الاخلاق جس کے چھاپنے میں علاوہ ہماری محنت و جاں کاہی کے سو روپئے ماہواری سے کم خرچ نہیں ہوتا۔ وہ اصل لاگت وصول ہونے کے لائق بھی فروخت نہیں ہوتا۔ پس ہم دوہرا نقصان یعنی اپنے صرف اوقات کا اور نیز روپیہ خرچ کرنے کا برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارا ارادہ ہے کہ رمضان کے بعد اس کو بند کریں گے۔ معہ ہذا بعض مناسب مضمون جو تہذیب الاخلاق میں چھپتے، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں موقعہ بہ موقعہ چھاپتے رہیں گے۔ اور اس خیال سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا جو نیا عنوان بنا ہے۔ اس میں لفظ معہ تہذیب الاخلاق بتایا گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت سے ہمارا اردہ تہذیب الاخلاق بند کر دینے کا تھا۔ مگر چونکہ آخر رمضان تک اس کے خریداروں نے قیمت بھیج دی تھی۔ اس لیے آخر رمضان تک اس کا جاری رکھنا جائز ہوا ہے۔'' ۳۴

سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد گزٹ ان کے فرزند سید محمود کی ادارت میں شائع ہوا۔ لیکن کچھ دنوں میں ہی بند ہو گیا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۰۱ء سے گزٹ کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں کے وقت گزٹ کی پابندی وقت کے بارے میں حالی کہتے ہیں۔

''اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا۔ اس عرصے میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہوگا جو اپنی تاریخ معین پر نہ نکلا ہو۔'' ۳۵

ایک ایسے دور میں نہ تو جدید پرنٹنگ مشین اور نہ ہی ضروری وسائل مہیا تھے اتنی کامیابی کے ساتھ ایک لمبے عرصے تک اردو اخبار نکالتے رہنا اپنے آپ میں جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ اردو صحافت جو اس اخبار سے پہلے گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ سرسید کے اس اخبار نے جیسے اردو صحافت میں جان پھونک دی اور ایک ہی زقند میں اس نے میلوں کا فاصلہ طے کرلیا۔
مولانا حالی کا یہ بیان دینا بے جا نہ ہوگا۔

''جو اخبارات سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے۔ ان کا مقابلہ ان اخباروں کے ساتھ کیا جائے۔ جو اس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے شائع ہوتے تھے ان کا موازنہ ان اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے جو اس کے بعد شائع ہوئے۔ اس مقابلہ سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے۔ مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاص کر اس میں ترقی کی روح پھونکی ہے۔ کیونکہ ان کے مضامین جلد جلد شائع ہوتے تھے اور مہینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گزرتے تھے اور یہ سلسلہ بتیس برس تک برابر جاری رہا۔'' ۳۶

اس اخبار سے ہی ٹائپ کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح سے سرسید صحافت کے فنی معیار کو بھی درست کرنا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں دشواریوں کا بھی انھیں پورا احساس تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا سو فی صد درست ہوگا کہ اپنے زمانے کے وہ اردو کے سب سے عظیم صحافی تھی جنھوں نے صحافت کو فن کی کسوٹی پر پرکھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی حقیقی کوششوں میں بھی کامیابی پائی۔

☆ خبروں کا حصہ

کسی بھی اخبار کے نکالنے کا سب سے پہلا اور اہم مقصد ہوتا ہے لوگوں کو روزمرہ کی خبروں، حقائق وواقعات اور حادثات سے واقف کرانا، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ واقعات اور خبروں کی سچائی اور ان کے معیار پر ہی اخبار کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔لوگوں کو جہاں اخبار سے چیزیں اور دنیا کے حالات معلوم ہوتے ہیں وہیں ان سے تعلیم وتفریح کے سامان بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف یہی اخبارات اور صحافت کسی بھی ملک میں اشتہار ودہشت اور تباہی وبربادی پھیلانے کے علاوہ حکومت بدلنے اور بغاوت کو بھڑکانے کا بھی موجب بن سکتے ہیں۔آج جدید وسائل سے لوگ اتنے زیادہ مانوس ہوچکے ہیں اور صحافت کی دنیا کا اتنا حصہ بن چکے ہیں کہ انہیں ناشتے کی ٹیبل پر ناشتے سے پہلے اخبار چاہیے۔انگریزی صحافی جوزف آرڈومنیک نے اپنی کتاب میں لکھا ہے

> "The newspaper does its best to get to your Breakfast table before you turn on the today show or leave to drive to work". 37.

آج اخبارات ہمارے لیے ناشتے کی ٹیبل کا حصہ بن چکے ہیں۔بغیر اخبارات کے ناشتہ بھی پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔کہیں باہر جانے سے پہلے ہی ہمیں سارے حالات سے آگاہی ہوجاتی ہے۔ظاہر ہے کہ جوزف آرڈومنیک کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔آج ہم اگر کسی صبح اخبارات کا مطالعہ نہ کریں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کچھ بھول رہے ہیں۔آج کا زمانہ اب صحافت کی اعلیٰ قدروں کا زمانہ بن چکا ہے اور پورا ملک ایک بستی میں تبدیل ہوگیا ہے اور ایسا کرنے میں صحافت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

سرسید احمد خاں نے بھی اس وقت ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اخبار میں خبروں کو جگہ دی۔گزٹ کا لغوی معنی بھی سرکاری اخبار ہوتا ہے۔ایسا اخبار جس میں حکومت کے تعلق سے خبریں شائع ہوتی ہوں۔دنیا کے پہلے اخبار The pecking Gazette میں چین کے محلوں کی خبریں دی جاتی تھیں اور پہلے اخبار کے نام میں بھی گزٹ لگا ہوا تھا۔سرسید کی دوراندیشی دیکھیے کہ انھوں نے نام بھی کتنا مناسب چنا ہے۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔یعنی ایسا اخبار جس میں انسٹی ٹیوٹ کی، سوسائٹی کی خبریں دی جائیں گی،لیکن اس میں دوسری خبریں بھی دی جاتی تھیں۔ظاہر ہے کہ عام لوگوں کی دلچسپی اخبارات میں تبھی ہوگی جب عام حالات وواقعات کا اخبار میں بیان ہو یا کچھ ایسی خبریں دی جائیں جو عام لوگوں سے تعلق رکھتی ہیں۔مثلاً فلاں جگہ پر موسلا دھار بارش ہوئی،فلاں جگہ پر زلزلہ کے جھٹکے محسوس کئے گئے یا پھر اس طرح کی خبریں کہ فلاں جگہ اسکول کا افتتاح ہورہا ہے وغیرہ وغیرہ۔سرسید نے ان باتوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے سولہ صفحات پر مشتمل گزٹ میں یہ ساری باتیں ملحوظ رکھیں اور اس وقت بھی ایک معیاری اخبار لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ گزٹ میں سائنٹفک سوسائٹی کی خبروں پر خاصہ دھیان دیا جاتا تھا۔اصغر عباس لکھتے ہیں:

> ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں خبروں کے ذیل میں اولین اہمیت سائنٹفک سوسائٹی کی خبروں کو دی جاتی تھی۔ چنانچہ گزٹ کے پہلے شمارہ میں جو اٹھارہ صفحہ پر مشتمل تھا۔اس میں تین صفحے سوسائٹی کی خبروں اور روئداد کو دیے گئے ہیں۔سوسائٹی کی خبروں کے بعد ان انجمنوں کی روئدادیں بھی اخبار میں مرقوم ہوتی تھیں۔ جو بالواسطہ سوسائٹی کے مقاصد کو پھیلانے میں معاون ہوتی تھیں۔ان خبروں کے بعد عام دلچسپی کی خبریں بھی درج ہوتی تھیں۔'' ۳۸

پورے اخبار کے ایک چوتھائی حصے میں خبروں کو جگہ دی جاتی تھی۔ایک چوتھائی کا آدھا حصہ اداریے کے لیے تھا۔

باقی کالم مضامین کے لیے مخصوص تھے۔ کچھ مضامین تو بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور ان پر خبر کا گمان ہوتا ہے۔ خبریں ملکی اور غیر ملکی دونوں ہوتی تھیں۔ غیر ملکی خبریں تار برقی کے ذریعے حاصل کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ دیسی خبروں کے لیے انگریزی اخبارات، پائیونیر، کرانیکل، گزٹ آف انڈیا، وغیرہ کی مدد لی جاتی تھی۔

گزٹ کے خبروں کے حصے میں ہمیں دیکھنے سے احساس ہوتا ہے کہ انکا انداز بیان خبروں کے جیسا نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک اصلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ جیسا کہ اصغر عباس لکھتے ہیں۔

''ابتدا میں گزٹ ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ ایک ہفتے وار اخبار میں خبر برائے خبر کی اہمیت وہ نہیں ہوسکتی جو ایک روزنامہ میں ہوتی ہے، کیونکہ اس کے لیے دو اشاعتوں میں کم سے کم وقفہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ گزٹ ایک تحریک کا ترجمان تھا۔ سرسید اس تحریک کے مبصر یا مفسر ہی نہیں روح رواں بھی تھے۔ لہذا گزٹ میں بعض خبروں کو اپنے تبصرہ کے ذریعہ مقصدیت کے غلاف میں ملفوف کر کے پیش کیا جاتا تھا۔

لیکن گزٹ میں خبروں کا ایک معتد بہ حصہ ایسا بھی ہوتا تھا جنھیں بغیر تبصرے کے شائع کیا جاتا تھا۔ یہ خبریں معروضی انداز نظر کی حامل ہوتی تھیں۔ لیکن گزٹ میں ایسی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی جو مقصدی نوعیت کی ہوتی تھیں۔'' ۳۹

گزٹ میں خبروں کے عنوانات بھی اپنی ایک کشش رکھتے تھے۔ عنوانات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اس خبر میں کیا ہے۔ بس ایک کوئی لفظ مثلاً بارش، کابل، کشمیر، راجہ صاحب وغیرہ لکھ دیے جاتے تھے اور پھر اس کے بعد خبر دی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ ۸/ جنوری ۱۸۶۹ء بروز جمعہ کی خبریں۔

بارش

''ہم اس خبر کے سننے سے کمال خوش ہوئے کہ جہلم میں کثرت سے بارش ہوئی۔ کرسمس یعنی بڑے دن کی رات کو مینہ برسنا شروع ہوا اور دوسرے دن برابر برستا رہا۔ اس سبب سے غلے کا نرخ ارزاں ہوگیا ہے لیکن کہتے ہیں کہ بیوپاریوں کے پاس کثرت سے غلہ موجود ہے۔ غالب ہے کہ اب یہ غلہ بہت جلد فروخت کے واسطے کھولا جاوے۔'' (Delhi Gazette) ۴۰

بارش کے عنوان سے دو باتیں پتہ چلتی ہیں یا تو بہت بارش ہوئی ہے یا پھر بارش نہیں ہوئی ہے لیکن یہاں کمال دانشمندی سے اور نہایت صفائی سے بارش کے ہونے کو غلے کے نرخ سے جوڑ دیا گیا ہے کہ اب ارزاں ہوگیا ہے۔ یہ خبر ترجمہ شدہ ہے لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ یہ خبر کہیں سے بھی ترجمہ شدہ نہیں لگتی ہے۔ دوسری خبر ملاحظہ ہو۔

کشمیر

''مہاراجہ کشمیر نے اس خیال سے کہ ان کے بڑے بیٹے کو انتظام ریاست کی لیاقت حاصل ہوحال میں ریاست کے خاص خاص معاملات کا بندوبست بڑے بیٹے کو سپرد کر دیا ہے۔ چنانچہ اس لڑکے کے پاس ایک کونسل امیروں کی مقرر کی گئی ہے جس میں وزیر پنو اور سردار اتر سنگھ وغیرہ شامل ہیں اور یہ امر قرار پایا ہے کہ اس کونسل جدیدہ کے فیصلوں کو خاص مہاراجہ صاحب منسوخ فرما سکتے ہیں۔ (Public Opinion) ۴۱

اسی طرح ۴/ اپریل ۱۸۶۶ء جمعہ کے اخبار میں ''فرانس'' کے عنوان سے شہنشاہ فرانس کے دربار کی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس گفتگو میں شہنشاہ نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ جب فرانس اور انگلستان کی بحری فوج بندرگاہ میں جمع ہوئی تو پرانی جنگ کے زخم تازہ ہوگئے مگر دونوں ملکوں کے باہمی تعلق میں کوئی کڑواہٹ نہیں آئی بلکہ دونوں ملکوں کے رشتے جنگ کے اتنے

دنوں بعد دھیرے دھیرے مضبوط ہو رہے ہیں۔

سرسید اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ گزٹ میں کسی طرح کی خبر چھوٹنے نہ پائے۔ اگر کوئی خبر رہ جاتی تھی، تو دوسرے ہفتے کے شمارے میں انگریزی اخبار کی تاریخ دے کر خبر شائع کر دی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو ۴ر اپریل ۱۸۶۶ء کا شمارہ جس میں Overland Mail کے ۲۶ر جنوری ۱۸۶۶ء کی خبریں شائع کی گئی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں خبریں ان انگریزی اخبارات سے لی جاتی تھیں۔ اور لینڈ میل، پایونیر، مفصیلٹ، گزٹ آف انڈیا، لندن نیوز، انگلش میل لندن، دی ٹائمز لندن، اڈنبرا ریویو، ہندو پٹریاٹ، فرینڈ آف انڈیا کلکتہ، بنگالی کلکتہ، اودھ گزٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دیسی اخبارات سے بھی خبریں لی جاتی تھیں۔ جن میں اودھ اخبار لکھنؤ، کارنامہ لکھنؤ، شمس الاخبار، مظہر الاخبار، نجم الاخبار، اخبار عالم میرٹھ، شعلہ طور کانپور، زبدۃ الاخبار، اخبار پنڈت بنارس، اکمل الاخبار، پنجابی اخبار لاہور، روہیل کھنڈ اخبار مرادآباد، دور بین کلکتہ، قاسم الاخبار میسور، اردو گائیڈ، دار السلطنت کلکتہ، لارنس گزٹ میرٹھ وغیرہ، قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف سوسائٹیوں اور انسٹی ٹیوٹ سے بھی خبریں اور ان کے اجلاس و روئداد کی تفصیلات حاصل کر کے شائع کی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی تعلیم اور پسماندگی دور کرنا سرسید کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ۱۸۸۵ء سے گزٹ میں ایک کالم ہی شروع کر دیا تھا۔ بقول اصغر عباس:

> اردو اخبارات میں سب سے زیادہ جس اخبار نے جدید تعلیم کی تخم ریزی میں نمایاں حصہ لیا وہ گزٹ تھا۔ اس نے اپنے زمانے کے باشعور طبقہ میں جدید تعلیم سے استفادہ کرنے کے لیے ایک ذوق وولولہ پیدا کر دیا۔ ۱۸۸۵ء سے گزٹ میں سررشتہ تعلیم کی خبریں کے عنوان سے ایک مستقل کالم ہوتا تھا۔ ان خبروں کا مقصد اہل ملک کو سررشتہ تعلیم کے واقعات سے باخبر رکھنا تھا۔ اگر ان خبروں کو ترتیب سے جمع کیا جائے تو اس زمانہ کے سررشتہ تعلیم کی ایک تاریخ اور ڈائرکٹری مرتب ہو سکتی ہے۔
> ''۴۲

سررشتہ تعلیم کے کالم میں درسی کتابوں، تعلیمی آلات، تعلیمی مضامین، اشتہارات برائے اساتذہ کرام، تبادلہ مدرسین، بحالی وغیرہ کی خبریں دی جاتی تھیں۔ سرسید جہاں ایک طرف اخبار کی آزادی کے خواہاں تھے وہیں دوسری طرف یہ بھی خواہش تھی کہ حکومت بھی ہندوستانی اخباروں کو آزادی دے۔ انگریزی اخبار نویس ہندوستانی اخباروں کی آزادی کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ قمر الہدیٰ فریدی اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے مارچ ۱۸۷۰ء کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''انھیں احساس تھا کہ انگریزی اخبار نویس ہندوستان میں اس قدر کسی فرقے سے ناراض نہیں ہیں جس قدر کہ وہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی آزادی سے۔ اس وجہ سے انھوں نے کبھی ہندوستانی اخباروں پر خوشامد کا الزام لگایا ہے۔ کبھی بغاوت کا الزام لگایا ہے۔ کبھی ہندوستانی راجاؤں کی جھوٹی طرفداری کا خیال خام لگایا ہے۔'' ۴۳

گزٹ کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ اخبار حکومت کا خیر خواہ تھا۔ اس بات میں جہاں تھوڑی سچائی ہے وہیں یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ جہاں بھی جب بھی حکومت نے ہندوستانیوں کی دل آزاری کی یا عوام کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی اس اخبار نے اس سلسلے میں علم بغاوت بلند کیا۔ ملاحظہ ہو یہ خبر۔ عدالتوں کے ملازمین میں کمی کرنے کے اعلان کے بعد یہ خبر شائع ہوئی۔

> ''ہم کو حیرانی یہ ہے کہ اس قسم کی تخفیف سے جو سردست گورنمنٹ نے تجویز فرمائی ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ کیا گورنمنٹ کی کچہریوں میں دو چار چپراسیوں اور دو چار پرانے محرروں اور دو چار بستہ برداروں ایک دو دفتریوں اور بڑے سے بڑے ایک دو سے زائد پیش کاروں کی تخفیف سے کوئی ایسا معتد بہ خزانہ جمع

ہوجاوے گا، جو قابل اعتبار ہے یا اس کے سبب سے کوئی بڑا خرچ موقوف ہوجاوے گا جس کی گورنمنٹ برداشت نہیں کرسکتی......ہماری دانست میں ایسے لوگوں کی تخفیف سے سوائے واویلا اور فریاد کے پیدا ہونے کے اور کوئی نتیجہ نہیں معلوم ہوتا اور ایسے لوگوں کی تخفیف سے علاوہ فریاد کے، انتظام کی ابتری کا بڑا اندیشہ ہے۔''۴۴؎

اسی طرح سے فساد ہونے پر اخبار اپنے انداز میں گورنمنٹ پر چوٹ کرتا ہے۔

''ہم کو تعجب ہے کہ حکام نے اس موقع پر پہلے سے کیوں نہ ایسا انتظام کرلیا جو یہاں تک نوبت نہ پہنچنے دیتا اور جو خرابی اب ہوئی وہ نہ ہوتی۔ ہماری رائے میں ہمیشہ ایسے موقع پر اگر ادنیٰ بھی احتمال فساد ہو تو بہ خوبی انتظام کرلیا جاوے۔''۴۵؎

انگریزوں نے جب چھ ہندوستانیوں کو ستمبر ۱۸۷۶ء میں قتل کردیا تھا تو اخبار سائنٹفک سوسائٹی نے اس طرح سے کھل کر انگریزوں پر نکتہ چینی کی۔

''یہ چھ خبریں قتل کی ہیں۔جن میں چھ غریب ہندوستانی مقتول اور چھ صاحب بہادر قاتل ہیں اور ان جملہ مقدمات میں اب تک یہ معلوم نہیں ہوا ہے کہ قاتلوں سے کیا مواخذہ ہوا۔ کیا غریب ہندوستانی اسی طرح کام آویں گے کہ ہمیشہ صاحب لوگوں کے گھونسوں اور لاتوں اور رولوں سے پٹ کر جان دیں گے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر گورنمنٹ انگریزی میں جان کی حفاظت کا دعویٰ شاید صحیح نہ ہوگا۔''۴۶؎

ان خبروں سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ سرسید جہاں انگریزی حکومت کے خیرخواہ تھے وہیں ہندوستانیوں کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ان کا یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت آسانی سے ہندوستان چھوڑنے والی نہیں ہے اور انگریزوں کا مقابلہ ہندوستانی نہیں کرسکتے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر وہ مسلمانوں اور ہندوستانیوں کو انگریزوں سے مل جل کر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ سرسید کی انگریزوں اور ہندوستانیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش تھی۔ باہمی روابط کو مضبوط کرنے میں بھی تہذیب الاخلاق کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔قمرالہدیٰ فریدی کا یہ اقتباس حرف بہ حرف صحیح نظر آتا ہے۔

''رائے عامہ پر اثرانداز ہونے اور لوگوں کے خیالات کو موڑ دینے کی جو زبردست طاقت پریس کو حاصل ہے۔اس کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک کی سالمیت، تحفظ اور بقا کی بہت بڑی ذمہ داری صحافی پر عاید ہوتی ہے۔اس کا فرض ہے کہ شہریوں کے درمیان بھائی چارے کی فضا قائم کرے۔ باہمی چپقلش اور کشیدگی کو ہوا دینے کے بجائے امن وامان کی بحالی میں مدد دے۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجراء کا منصوبہ بناتے وقت یہ بات سرسید کے ذہن میں تھی۔ اور جب اخبار جاری ہوگیا تو یہ کام اس نے بخوبی انجام دیا۔اور اس نقطہ نظر سے سرسید کی صحافت ایک ایسی صحافت ہے جس کا پیغام محبت ہے۔''۴۷؎

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی خبروں کی حقیقت پر بھی خاص دھیان دیا جاتا تھا۔خبروں کا انتخاب ان کی اہمیت کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔اس کام میں کافی دیانت داری اور ایمان داری برتی جاتی تھی۔تبھی تو مولانا حالی گزٹ کی خصوصیات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''ایک اور خصوصیت اس اخبار کی، اس کی باقاعدگی، جو اکثر دیسی اخباروں میں مفقود ہے اور اس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جانا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سروپا خبروں سے مبرا دیکھا گیا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر کاغذ سے (الاماشاءاللہ)

اس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعے کی نسبت شروع سے اخیر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں۔'' ۴۸؎

بے اصل خبریں کے عنوان سے ایک اداریے میں سرسید بھی قارئین سے فرماتے ہیں۔

''ہم کو کوئی ہفتہ نہیں گزرتا کہ جس میں دو چار خبریں ہم کو ایسی نہیں معلوم ہو جاتیں جو قدرت خدا کے عنوان سے تعبیر ہوتی ہیں۔ اور جب ہم ان میں سے کسی کی تفتیش کے در پے ہوتے ہیں تو کسی کی تصدیق نہیں ہوتی۔ پس خیال کرنا چاہیے کہ جو اخبار ضروری تصدیق کا ذریعہ ہے۔ افسوس ہے کہ اب اس سے بے ہودہ اور بے اصل خبروں کا کام لیا جاتا ہے۔'' ۴۹؎

یہ بات سچ ہے کہ خبروں کو چھان پھٹک کر ہی شائع کیا جاتا تھا لیکن اخبار کا کام کافی جلد بازی کا ہوتا ہے۔ اس لیے غلطی کی گنجائش بھی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ستمبر ۱۸۸۰ء کے شمارے میں مرزا داغ دہلوی کی وفات کی خبر شائع ہوگئی تھی، لیکن دوسرے شمارے میں اس کی معذرت بڑے ہی شریفانہ اور مہذب انداز میں سرسید نے اس طرح کی۔

''ہم کو نہایت رنج و افسوس ہے کہ عنایت اللہ خاں قیس نے جو تاریخ داغ کی وفات کی بہ خیال موتوا قبل ان تموتو اہمارے پاس بھیجی۔ وہ اخبار میں چھپ گئی۔ اکمل الاخبار دہلی سے ہم کو مژدہ ملا کہ وہ فضل الٰہی سے زندہ و صحیح و سلامت ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ مگر اس غلطی کا ہم کو دانا ہے۔ زندگی میں موت کی خبر درازی عمر کا شگون سمجھا جاتا ہے۔ خدا ایسا ہی کرے مگر اس غلطی سے ہمارے شفیق داغ کو یہ لطف ضرور آیا ہوگا کہ لوگ ان کی کیسی قدر کرتے ہیں اور جو امر نا گزیر سب کو پیش آنے والا ہے۔ جب ان کو بھی پیش آوے گا تو لوگ ان کو کس طرح یاد کریں گے۔'' ۵۰؎

یہاں پر کسی قدر صفائی سے ''داغ'' کا استعمال کر کے بات کو دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں داغ کو تکلیف ہوتی تو انھیں یہ احساس دلایا گیا کہ وہ کتنے مشہور و مقبول ہیں۔ یہی خوبیاں سرسید کے گزٹ کو اردو صحافت کے دوسرے ستونوں سے ممتاز بناتی ہیں۔

اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی صحافتی کاوشوں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دردمند، سیکولر، وسیع النظر اور پختہ شعور رکھتے تھے۔ ایک سچا اخبار نویس وہی بن سکتا ہے، جو عوام اور حکومت کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرے اور اس کام میں سرسید دوسرے اخبار نویسوں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

☆ اداریے اور مضامین

اخبارات میں خبروں کو جس طرح سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح اخبارات میں ایک ورق یا ایک کالم اداریے کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کالم میں اخبار حالات حاضرہ پر تبصرہ پیش کرتا ہے اور اسی کالم سے اخبار کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔ کچھ اخبارات کے اداریے تو اخبارات کی جان ہوتے ہیں اور لوگ اخبارات کو صرف اس لیے خریدتے ہیں کہ اداریے کو پڑھ سکیں۔ اداریوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں تک معللو مات کو واضح صورت میں پہنچایا جائے۔ اسکے علاوہ لوگوں کو خبروں پر ایک تفصیلی تبصرہ مہیا کرایا جائے تا کہ لوگ اس خبر کے تمام نکات سے باخبر ہو سکیں اور ایک حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ دنیا کے تقریباً سبھی اخبارات میں اداریے ہوتے ہیں اور اداریے ہی یہ واضح کرتے ہیں کہ اخبار کا نظریہ کیا ہے۔ خبریں سبھی اخبارات میں ایک جیسی ہو سکتی ہیں لیکن اداریے ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ اداریے ہی ایک اخبار کو دوسرے سے مختلف ثابت کرتے ہیں۔ اور کسی بھی اخبار کی کامیابی یا ناکامی میں اداریوں کا سب سے اہم کردار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی

لکھتے ہیں۔

> دنیا کے ہر خطے میں اخبارات کا آغاز کم وبیش ایک ہی مقصد کے تحت ہوا تھا،یعنی تبلیغ واصلاح۔ابتدامیں ہر اخبار کا اجرا ایسی قد آور شخصیت نے کیا تھا جس کا مقصد ملک وقوم کی اصلاح،عوام کی رہنمائی اور رائے عامہ کی تشکیل تھا۔برصغیر پاک وہند میں سرسیداحمد خاں،مولانا محمد علی جوہر،مولانا حسرت موہانی،مولانا ابو لکلام آزاد،مولانا ظفر علی خاں،مولانا محمد اکرم خاں اور ایسے ہی دوسرے زعمانے اپنے اخبار ملک وقوم کی اصلاح،آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے اور قوم میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے جاری کئے تھے۔ان کے اخبارات میں ادارتی صفحات کو بنیادی اور اولین اہمیت حاصل ہوتی تھی، کیوں کہ ان شخصیتوں کے افکار وخیالات مقالات کی صورت میں ادارتی صفحات پر ہی شائع ہوتے تھے۔[۵۱]

یوں تو اداریہ نویسی کی ابتدا سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے پہلے ہی ہو چکی تھی لیکن باضابطہ طور پر اداریہ کا ارتقاء سرسید کے اخبار سے ہی ہوا۔ بقول اصغر عباس:

> ’’اس سے قبل اردو اخبارات میں اداریے لکھنے کا رواج عام نہ تھا۔گزٹ نے اسے عام کیا۔گزٹ کے کچھ متعین مقاصد تھے انھیں مقاصد کی اشاعت کے لیے گزٹ کا اجراء ہوا تھا۔اس لیے گزٹ کے اداریوں میں نہ تو ہنگامہ خیزی ملتی ہے اور نہ بے جا جوش وخروش،لیکن دلیلوں کا استحکام موضوع سے واقفیت اس قدر گہری ہوتی ہے کہ ان کی تردید کرنا آسان نہیں ہوتا۔ان اداریوں میں مقفیٰ ومسجع جملے نہیں ملیں گے۔ معروف رنگ میں ادبی رنگ تلاش کیا جائے تو مشکل سے ملے گا۔‘‘[۵۲]

اداریوں میں عام طور سے عام فہم زبان استعمال کی جاتی ہے۔زیادہ طوالت سے بچا جاتا ہے۔حالات حاضرہ کے ایسے مسائل پر تنقید کی جاتی ہے۔جن کا عوام سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔جھوٹ، بے جا مبالغہ آرائی،لفظوں کی شعبدہ بازی سے بچا جاتا ہے۔اچھی اداریہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی پریشانیوں اور ان کے مسائل کی پوری جانکاری اخبار کو ہو تبھی اخبار اپنے اداریے سے مقبول ہوسکتا ہے۔’’رہبر اخبار نویسی‘‘ کے مصنف سید اقبال قادری لکھتے ہیں:

> ’جعل سازی، غلط بیانی اور دہشت انگیزی سے کام لینے والے اخبارات زیادہ دیر تک نہیں پنپ سکتے۔ جھوٹ،فریب اور دھوکہ دہی کا بھانڈا جلد ہی چھوٹتا ہے۔ایک ماہر اداریہ نگار نے کیا خوب کہا تھا کہ: چار سگریٹ برابر ہیں ایک گھنٹہ کے،دو گھنٹہ برابر ہیں ایک خیال کے،تین پیراگراف برابر ہیں ایک نظریے کے اوران تمام کا نتیجہ ایک اداریے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔‘‘[۵۳]

سرسید احمد خان نے بھی ان ساری باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا اور صحت مند معاشرے کی تعمیر میں پوری پوری کوشش کی۔ عوام کے معاملات کو حکومت تک پہنچانے میں سرسید احمد خان کے اخبار نے اہم کردار ادا کیا ہے۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اداریے زیادہ تر سرسید نے خود ہی لکھے ہیں۔ان اداریوں میں حکومت اور عام ہندوستانی کو جہاں قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے وہیں حکومت پر سیدھے سیدھے حملہ کیا گیا ہے۔

> ’’سرا جلاس ایک نوجوان اسسٹنٹ مجسٹریٹ الہ آباد نے ایک ہندوستانی مختار کا جوتا اتروا کر اس کے سر پر رکھوایا اور چند منٹ تک اس کو اسی طرح کھڑا رکھا۔ چوں کہ وہ ایک ہندوستانی تھا اور اس کی عزت اور بے عزتی کا اثر تمام قوم پر ہوتا ہے۔اس وجہ سے دور اندیش لوگوں کو اس خبر کے سننے سے نہایت ہی افسوس ہوا ہوگا۔جس تیز مزاج افسر نے اپنی دانست میں اس حرکت کو اپنی حکومت کی شان سمجھا، ہماری دانست میں وہ اپنی ہم قوم گورنمنٹ کے عدل وانصاف کا حامی نہیں ہے اور شاید وہ اپنی اس تیز مزاجی کے سبب سے

گورنمنٹ کے نامور ملازموں میں شمار نہ ہوسکے گا۔ اس افسر نے شاید اپنے نزدیک ہندوستان میں اپنی عدالت کو انتہائی عدالت خیال کیا جس کی ورد نہ فریاد۔ ورنہ کوئی ضابطہ انصاف اس کارروائی کو منصفانہ نہیں کہہ سکتا۔'' ۵۴

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کو اس بات سے کتنا صدمہ پہنچا ہے اور انھوں نے اس غریب ہندوستانی مختار کے لیے آواز اٹھائی۔ ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو، اس اداریے کا عنوان ''زبردستی کا سلام'' ہے۔

''بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ گو کیسا ہی معزز اور شریف ہندوستانی ہے اور گو وہ بگھی یا ٹم ٹم ہی پر کیوں نہ جاتا ہو اور اگر ادنیٰ صاحب بہادر تشریف لے جاتے ہوں اور وہ ہندوستانی صاحب کو سلام کر لے تو صاحب ہرگز اس کا سلام نہیں لیتا اور ان کی اس بے پروائی سے صرف یہی نہیں ثابت ہوتا کہ صاحب کی کج خلقی اور تندمزاجی تھی، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہایت ذلیل سمجھے جاتے ہیں اور شاید وہ کسی عزت کے اس وقت تک مستحق نہیں ہیں جب تک کہ وہ ہندوستانی ہونے کا سیاہ ٹیکا اپنی پیشانی پر سے نہ چھٹاویں۔ ہماری گورنمنٹ جس کی بیدار مغربی نہایت شہرہ آفاق ہے کیا وہ اس بات کو نہ جانتی ہوگی کہ ہندوستانی کو اپنی اس ذلت سے کیسا صدمہ ہوتا ہے۔'' ۵۵

اس اداریے میں بھی سرسید نے حکومت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی ہے۔ سرسید کے اداریوں میں جہاں حکومت کے خلاف بات کی گئی ہیں۔ وہیں تعلیم وتربیت، ہندوستانیوں کی زبان اور دوسرے مسائل کا بھی ذکر ہوتا تھا اور کبھی کبھی تو سرسید مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بڑی جذباتی اور اثر انگیز تحریریں شائع کرتے تھے۔ مثلاً یہ اداریہ جو انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم ومسائل پر تحریر کیا ہے۔

''ہم اپنی قوم کو بارہا بتا چکے ہیں کہ جب تک مسلمان خود اپنی تعلیم کا بوجھ آپ نہیں اٹھاویں گے اس وقت تک ان کی ذلت، ان کا ادبار دور نہیں ہوسکتا۔ اس ہمارے قول کی تصدیق ہو چکی ہے اور جو رہی سہی باقی ہے وہ جلد ہونے والی ہے۔ قوم کی جو حالت ہونے والی ہے اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے ہمارے دل کو دکھایا ہے۔ اس ہمدردی اور دل دکھنے سے ہم نے مسلمانوں کے لیے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے کا بوجھ اٹھایا ہے۔ مگر افسوس کہ بہت تھوڑے آدمیوں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی......اے مسلمانو! دیکھو وقت چلا جاتا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ تم سب پر فرض ہے کہ مدرسۃ العلوم کی تکمیل پر توجہ کرو۔ صرف اس کو روپیہ کی مدد درکار ہے۔ محنت کرنے والے موجود ہیں۔ پس ہمت کرو اور چندہ سے امداد کرو۔'' ۵۶

یہاں سرسید نے قوم کے سامنے تعلیم کی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اداریے کے دوسرے حصے میں سرسید کا انداز خطیبانہ ہو گیا ہے اور وہ کھل کر تقریری انداز میں اے مسلمانوں کہتے ہوئے چندے کی درخواست کرتے ہیں۔ یہاں سرسید کی دور اندیشی نظر آتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی ترقی میں مائل جاہلیت کو دور کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کو ضروری خیال کیا اور اس کے قیام کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی۔

مسلمانوں کی ترقی کے لیے ایک اور اداریے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''افسوس ہے کہ بنگالہ کے مسلمانوں نے جو تدبیر مسلمانوں کی ترقی کی اختیار کی ہے اس سے ہم کو اختلاف کلی ہے۔ ان کی تدبیر جس پر وہ مختلف طریقوں سے زور دے رہے ہیں یہ ہے کہ گورنمنٹ کی مسلمانوں کے لیے خاص رعایت مبذول ہو۔ سابق میں بھی اس مطلب سے انھوں نے بہت زبردست درخواست پیش کی تھی

اور حال میں نوا کھالی کے مسلمانوں نے اس قسم کی درخواست پیش کی ہے۔ ہم اس تدبیر کو پسند نہیں کرتے۔
ہمارا اصول سیلف ہیلپ پر مبنی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان خود اپنی ترقی کے لیے آپ کوشش کریں۔''
۵۷

انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مختلف اداریوں کو دیکھنے کے بعد جو سب سے اہم بات نکل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے ان اداریوں کے ذریعے جہاں تعلیم، مذہب، معاشی مسائل و پسماندگی، غربت کا رونا رویا ہے وہیں انگریزوں کو ہمیشہ عزت دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ عزت اس لیے تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو اپنا سمجھیں اور یہی وجہ ہے کہ سرسید نے انگریزوں کے لیے صاحب، صاحب بہادر، بڑے صاحب جیسے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں۔ سرسید کے اداریوں کو اگر ایک جمع کر دیا جائے تو اس وقت کے ہندوستان کی ایک واضح شبیہہ ابھر کر سامنے آئے گی۔ کالے گورے کا فرق ہو، اردو ہندی کا مسئلہ ہو، تہذیب و تمدن، سچ، جھوٹ یا پھر کوئی دلدوز واقعہ ہو۔ سرسید نے سبھی کو اداریے میں بیان کیا ہے یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان کا اخبار صرف مسلمانوں کی طرف ہی توجہ نہیں دیتا تھا بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی انھیں کافی محبت تھی اور اس طرح سرسید کا ایک سیکولر خاکہ نظر آنے لگتا ہے۔ جیسے ان کا لکھا یہ اداریہ:

''اگر کوئی مذہب سچ ہے اور معتقد اس کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو ان کو یقین کرنا چاہیے کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور ہمدردی پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے۔ پس اگر اس فرض کو ہمیشہ خیال میں رکھیں تو کسی مذہب سے انسان کے دل میں بغض و حسد، کینہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ ہمارا تو یہی یقین ہے اور اسی پر برتاؤ ہے۔''
۵۸

اسی طرح کی ایک خبر ملاحظہ ہو۔ جس میں جین مذہب کے مندر کا ذکر کیا گیا ہے۔

''صاحب اخبار دہلی گزٹ لکھتے ہیں کہ جین مت کا جو نہایت پرانا مندر اجمیر میں ہے اس کی جانب لوگوں کو توجہ کرنی چاہیے۔ کہتے ہیں کہ اس مندر کو بنے ہوئے قریب ڈھائی ہزار برس کے ہوئے مگر اب وہ روز بروز مسمار ہوتا جاتا ہے اور سررشتۂ تعمیرات، سرکاری کی دست اندازی نے اس کو اور بھی زیادہ برباد کر دیا ہے۔''
۵۹

اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں چھپنے والے مضامین کے ساتھ مضمون نگار کا نام بھی دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی اچھا مضمون ہے اور وہ دوسرے اخبار میں چھپا ہے تو شکریے کے ساتھ سرسید اسے اپنے اخبار میں بھی شائع کرتے تھے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

''اودھ اخبار میں پایونیر سے ایک مضمون ترجمہ ہو کر چھپا ہے۔ جس کا عنوان قانون وراثت اسلام ہے۔ اس مضمون کو ہم نے بھی اپنے آج کے اخبار میں مندرج کی ہے۔ ہم اس مضمون کے ماحصل سے متفق ہیں۔ مگر اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے احکام قابل ترمیم یا تبدیل ہیں۔ قرآن مجید بہ طور کلیہ کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانے میں بھی اس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔'' ۶۰

ایک باصلاحیت صحافی کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی خبر ایسی نہ شائع جس سے کسی بھی مذہب یا خاص قوم کی دل آزاری ہو، لیکن یہاں اس بات سے بھی انکار ناممکن ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم پر ظلم کر رہی ہے تو ظالم کے خلاف نکتہ چینی یا تنقید کے جتنے بھی کلمات کہے جائیں گے وہ کم ہونگے۔ صحافت کے قصر کی تعمیر سچائی، حقیقت حال، مطالعے اور تحقیق سے ہی ہوسکتی ہے اور سرسید ان سبھی میدانوں کے شہسوار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی خبروں کو بھی شائع کیا۔ جذباتی معاملات میں صبر کا دامن بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ نہ ہی انہوں نے کسی ایک خاص قوم و پارٹی کا ساتھ دیا بلکہ صرف اور صرف سچائی اور عوام کی فلاح کے لیے صدائے حق بلند کی۔ حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''ان کی زندگی کے ۴۵ سالوں میں بلکہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنے زیادہ مضامین مختلف ضخامت میں، اتنی گراں خوبیوں میں، اتنے اعلیٰ فوائد میں اتنی کثیر، اتنی وسیع تصانیف کی ہیں۔''۶۱

سرسید احمد خاں نے اپنے اخبار کے ذریعہ جو کوشش کی وہ بعد کے اخبارات نے بھی جاری رکھی۔ بلکہ دوسرے اخبارات نے ان کی صحافت سے بہت کچھ سیکھا اور اردو صحافت بھی نئے اسرار و رموز سے آگاہ ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں۔

''علی گڑھ کا معارف، مولانا عبدالحلیم شرر کا مہذب اور بڑی حد تک دل گداز وغیرہ نے سرسید کی صحافتی رسوم و قیود کی بعض باتوں کو قائم رکھا۔ اخبار نویسی نے جو بڑے بڑے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان میں الہلال، زمیندار اور ہمدرد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ الہلال ہماری جذباتی صحیفہ نگاری کا بے مثال شاہکار ہے۔ الہلال کی گہری جذباتی اور احساساتی فضا سے قطع نظر دیدہ زیبی اور دلکشی کے اہتمام کے اعتبار سے اس کو سرسید کے اخبارات کے پہلو میں جگہ دی جاسکتی ہے''۔۶۲

سرسید نے اپنے اخبار میں تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشیات اور اقتصادی و ترقیاتی منصوبوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی پوری طرح سے ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ انفرادی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور قومی ترقی پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے بڑے ہی قریب سے غدر کے وقت کے حالات کا مشاہدہ کیا تھا جب ان کے اپنے قریبی رشتہ داروں کا دہلی میں قتل عام کر دیا گیا تھا اور دہلی کو غربت اور تاریکی کے اندھیرے میں دھکیل دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ الٹے مسلمانوں پر ہی اس قیامت خیزی کے الزامات لگے تھے اور قوم کے درد نے انھیں اس طرح کی تحریریں بھی لکھنے پر مجبور کیا۔

''ہم نے ایک نواب زادے کو جو ابھی غدر میں تباہ ہوا تھا۔ دیکھا تو ہم کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کوئی تمبا کو فروش ہے۔ ہم نے انشاء اللہ خاں کے پوتے کو بھی دیکھا ہے اور ہم کو ان کی حالت اور صورت سے ہرگز اس بات کو یقین نہ ہوتا تھا کہ ایسے نامور کی نسل میں ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے؟ ہم نے بادشاہ زادے بھی دیکھے جو گولا کبوتر کو سیٹی پر لگانے اور طوطوں کو پنجروں پر اڑائے اور بٹیروں کو لڑانے کے سوائے اور کوئی شان شاہزادگی نہ رکھتے تھے اور جب ہم نظر کرتے تھے تو ہم کو خود اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ بلاشبہ یہ قوم تباہ ہو جانے کے لائق ہے۔''۶۳

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سرسید نے صنعت و حرفت، گھریلو روزگار، نئے وسائل اور زراعت کے نئے طریقوں پر بھی زور دیا اور اپنے اخبار کے ذریعے تجارت کے پیشے کو بھی عام کرنے کی کوشش کی۔ اپنے اخبار کے ذریعہ جہاں انھوں نے معاشرے کی اصلاح اور پسماندگی دور کرنے کی کوشش کی وہیں ایک سچے صحافی کا رول ادا کر کے صحافت کے معیار کو بھی برقرار رکھا۔ ان کے کچھ مضامین جو فن صحافت پر ہیں اتنے اچھے ہیں کہ فن اخبار نویسی کا ایک چھوٹا کتابچہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے ۱۰/ مارچ ۱۸۷۶ء کے شمارے میں بعنوان ''انگریزی اخبار نویس ہندوستانی اخباروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔'' لکھتے ہیں۔

''اگر انگریزی اخبار اس بات پر ناز کریں کہ وہ گورنمنٹ وقت کی زبان ہیں تو یہ ان کا ناز کچھ بے جا نہیں ہے مگر البتہ اس ناز پر کوئی ان کا فصل یا خیال مبنی ہو تو ضرور بے جا ہے اور اس لحاظ سے اپنی ہم قوم گورنمنٹ پر ناواجب طرف داری کا الزام قائم کرنا ہے۔''۶۴

ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو۔ جس میں انھوں نے دیسی اخبارات کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔

''باقی رہی ہندوستانی اخباروں کی اصلاح، یہ از خود رفتہ رفتہ ہوتی جاتی ہے، جو حالت پانچ برس پہلے اخباروں کی تھی اس میں رائے دینا اور گورنمنٹ کی کارروائیوں پر ریویو کرنا حال میں شروع ہوا ہے اور اس لیے اس میں غلطی کا ہونا اور خلاف اصول علم، اخلاق وقوانین کے مباحثہ کا آجانا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔علم اصول، اخلاق وقوانین اور علم انتظام وسیاست مدن روز بروز ہندوستانیوں میں پھیلتا جاتا ہے اور جوں جوں اس کی ترقی ہوگی۔ اخباروں کی رائیں نسبت پولیٹیکل باتوں کے زیادہ تر صائب وصحیح ہوتی جاویں گی اور یہ نقص جواب دکھلائی دیتا ہے از خود رفتہ رفتہ رفع ہو جاوے گا لیکن اگر گورنمنٹ کی مداخلت ہوئی تو ہماری رائے میں بہت زیادہ مضرت پیدا ہوگی۔''۶۵

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنے ہم عصر ایڈیٹران اخبارات کی رائے پر نکتہ چینی کریں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی اخبار باوقعت رہیں اور پارسا ہوں نہ بار خاطر۔''۶۶

سرسید احمد خاں نے اپنی صحافت میں صحافت کے اصولوں سے کبھی روگردانی نہیں کی اور اپنی بات کہنے سے بھی نہیں چوکے۔عورتوں کی تعلیم ہو یا اردو ادب سبھی کا ذکر کیا ہے۔ایک جگہ مشاعرے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''ہم نے سنا ہے کہ ارباب کمال لکھنؤ نے بھی ایک خاص جلسہ کی طرح ڈالی ہے جس کا نام مشاعرہ ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ بھی اپنے وسعت خیال کو صرف انھیں معمولوں میں محدود نہ رکھیں اور صرف اسی پرانی طرز پر نہ جمے رہیں۔جو اب تک ہند میں مروج ہے بلکہ وہ جدید طرز جس کے محرک مولوی محمد حسین صاحب آزاد ہیں۔سب لوگ اختیار کریں اور ہر قسم کے مضامین نظم زبان میں ظاہر کرنے کا قصد کریں جس کے سبب سے اردو زبان بھی مثل اور زبانوں کے کارآمد اور مفید زبان ثابت ہو۔''۶۷

جہاں آج ایک اخبار دوسرے اخبار کو دیکھنا نہیں چاہتا وہیں سرسید دوسرے اخبارات کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے مدیر کی موت پر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

''ہم کو اس خبر کے دیکھنے سے سخت قلق ہوا کہ ہمارا ایک لائق ہم عصر جو اپنی تیزی طبیعت اور جدت مزاج اور قوت حافظہ کے لحاظ سے یکتا تھا۔اس نے اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ہم کو اس کا نام لکھنے سے درد معلوم ہوتا ہے اور ہم کو یہ بات کہتے رنج ہوتا ہے کہ محمد وجاہت علی خان صاحب مالک وراقم ''اخبار عالم'' اس جہاں فانی سے انتقال کر گئے۔ہم کو اپنے دوست کے اخلاق یاد آتے ہیں اور ہم یہ خبر صبر کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔''۶۸

سرسید احمد خاں نے اردو صحافت کو بامقصد اور مفید بنانے میں بڑا کام کیا ہے۔انھوں نے اعتدال پسندی اور حکومت کی پالیسیوں کو ماننے کے ساتھ ساتھ مناسب تنقید کا حق ادا کیا۔سرسید کی کوششوں نے ایک طرف لوگوں میں عام سیاسی اور تعلیمی شعور پیدا کیا اور دوسری طرف اردو زبان وادب کی اصلاح کر کے اسے زندگی سے ہم آہنگ کیا۔سرسید احمد خاں کی صحافت کے دوش بدوش اردو صحافت کو ایک نیا نقطہ نظر، ایک نظریہ عطا ہوا اور سرسید کی صحافتی کوششوں سے ہی اردو صحافت ۱۸۵۷ء کی خونی فضا کے بعد بھی بڑی تیزی سے پھلی پھولی۔

ایک صحافی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ عوام کو قاری کو تمام باتوں سے باخبر رکھے اور اس کے علاوہ دوسری دلچسپیوں پر بھی اخبار کا نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔سرسید نے اپنے اخبار میں ان باتوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا اور روزمرہ کے کام میں آنے والی باتوں پر بھی انھوں نے مضامین لکھے،ضروری اطلاعات بہم پہنچائی۔غلے کا نرخ،تار برقی کا محصول،علاج معالجے،گھریلو

روزگار، فنائل بنانا، ہیئر آئل اور اس طرح کے دوسرے کارآمد اور آزمودہ نسخے بھی سرسید کے اخبار میں نظر آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی سرسید نے کوئی خبر شائع کی ہے اور ساتھ ساتھ اپنا نظریہ یا اپنا خیال بھی پیش کر دیا ہے۔ وہیں موت کی خبر ہے یا ناگہانی آفت کی خبر ہے تو اسے بھی ایسے انداز میں پیش کیا ہے۔ جیسے اخبار والے کو بھی اس ناگہانی آفت سے کافی صدمہ پہنچا ہو۔ یہ خبر ملاحظہ ہو۔

زلزلہ

''۱۰/ ماہ حال کو مقام کلکتہ میں زلزلہ آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت دور تک اس کا اثر ہوا ہمارے ایک کار سپانڈنٹ کا بیان ہے کہ بردوان تک اس کا صدمہ پہنچا اور مقام سنچر سے بذریعہ تار برقی کے معلوم ہوا ہے کہ وہاں اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ تمام بنگلے گر پڑے۔ اور تمام بازار میں نہایت ابتری ہوگئی۔ ہم کو اس کا نہایت قلق ہوا ہے۔'' ۶۹

سرسید کے اخبار میں ایک کالم مختلف واقعات کے نام سے تھا جسے ہم آج کی صحافتی اصطلاح میں News at a glance کہہ سکتے ہیں۔ ۵/ مارچ ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع خبر ملاحظہ ہوں۔

۔ ''یقین ہے کہ ہمارے اخبار کے پڑھنے والے اس خبر کے سننے سے خوش ہونگے کہ ہمارے صاحب لفٹیننٹ گورنر بہادر سر ولیم میور صاحب کو بطور ورثہ کے ایک جائداد قیمتی ایک لاکھ دس ہزار روپے کی ہاتھ لگی ہے۔

۔ ''مقام امرتسر میں ایک ہزار سے زیادہ محتاجوں کو گورنمنٹ ہر روز کھانا دیتی ہے اور سوائے ان کے تعمیرات سرکاری میں دو ہزار قلی نوکر ہیں۔'' ۷۰

اس طرح سے سلسلے وار خبریں دی جاتی تھیں اور مختلف واقعات کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ ان خبروں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عوام کچھ اہم خبروں سے جلد سے جلد باخبر ہو جائیں۔

اشتہارات کے لیے بھی ایک کالم مخصوص تھا۔ کبھی کبھی اخبارات میں عرضی بھی شائع ہوتی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

''عرضی بخدمت ڈپلومہ، سرل صاحب بہادر قائم مقام رجسٹرار ہائی کورٹ ممالک مغربی وشمالی خاتمہ پر ہم نہایت تعظیم وتکریم سے یہ عرض کرتے ہیں کہ عدالت ہائی کورٹ لوکل گورنمنٹ سے یہ سفارش فرماوینگی کہ وہ رجسٹری کا کام اس کی فیس سمیت پھر ہم کو مرحمت فرماوے جس سے ہم محروم ہوگئے ہیں اور یا گورنمنٹ ہندوستان سے یہ تحریک کرے کہ وہ ہماری تنخواہوں کی اس قدر ترقی فرماوے کہ جو نقصان ہم پر عاید ہوا ہے اس کا عوض ہو جاوے۔'' ۷۱

اس کے بعد عرضی فدویان کی ایک فہرست ہے۔ جس میں سب سے پہلا نام سرسید احمد خاں کا ہے ان کے علاوہ عبدالعزیز خاں، حبیب اللہ خاں، اے سندر لال وغیرہ کے نام ہیں۔ ایک دوسری اطلاع اسی طرح کی ہے۔ جس میں سرسید کا لندن کا پتہ دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ۷/ ستمبر ۱۸۶۹ء کا اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔

اطلاع

''مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر کے دوستوں نے ان کے پاس ولایت میں ایسی طرح پر خطوط روانہ کیے جن پر پتہ صحیح لکھا نہ تھا اور اس سبب سے خطوط نہایت مشکل سے پہونچے پس ان کے دوستوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ مفصل ذیل نشان سے ان کے نام خطوط روانہ کیا کریں اور لفافے پر نام اور نشان وغیرہ سب انگریزی میں لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی، معرفت مسٹر ہنری ایس کنگ وکمپٹی۔نمبر ۶۵ بازار کارن ہل، لندن، واقع انگلستان۔''۲؎

سر سید احمد خاں نے صحافت کو ایک تعلیمی ہتھیار کی طرح استعمال کیا اور انھوں نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو اثر انداز کیا وہیں اردو صحافت بھی سر سید کے احسان سے ابھر نہیں سکتی۔سر سید سے پہلے صحافت کا کوئی واضح دستورالعمل نہیں تھا۔بقول اصغر عباس۔

''جدید علوم وفنون کی اہمیت کا احساس، صحافت کے لیے ایک اخلاقی دستورالعمل کی ضرورت، آزادی رائے، عوامی مسائل اور آزادی صحافت کا خیال موجود تھا۔لیکن ان خیالات کو ایک رخ پر ڈالنے اور ان سے کوئی تعمیری کام لینے والا کوئی صاحب عزم فرد نہیں تھا۔سر سید جب صحافت کے کوچہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے اردو صحافت کی خامیوں کو زیادہ معقولیت سے سمجھا اور زیادہ قوت سے انھیں دور کرنے کا عزم کیا۔انھوں نے گزٹ کے ذریعہ صرف یہی نہیں کیا کہ اس عہد کے اضطراب کی عکاسی کی بلکہ اس کے ذریعہ انھوں نے ایک نئے اضطراب کو جنم دیا جو شعوری بھی تھا اور منظم بھی۔''۳؎

اس دور کے حالات کی جتنی بہتر عکاسی سر سید کے اس اخبار نے کی ہے دوسرے کسی اخبار میں ایسا نہیں ہے۔معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں گزٹ نے نہ لکھا ہو۔عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں۔

''سر سید کی بڑی قابلیت یہ تھی کہ وہ عوام کے خیالات کی ترجمانی بے باکی کے ساتھ، لیکن اس طرح دامن بچا کر کرتے تھے کہ کچھ بات بھی بن جاتی تھی۔اور اجنبی حکومت کے ارباب بھی زیادہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔ان کے اخبار کی ایک بڑی خوبی خبروں کی صحت اور اختصار ہے۔اس زمانے کے اخباروں میں طویل خبریں چھپتی تھیں۔ترجمہ غلط سلط ہوتا تھا اور خیال آرائی زیادہ کی جاتی تھی۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بعض مقامات پر ترجمے کی غلطیاں ملتی ہیں لیکن اتنی نہیں کہ عبارت کا اصل مقصد مسخ ہو جائے۔ان خوبیوں کے طفیل انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو ہندوستان کی اردو صحافت میں وہی حیثیت حاصل تھی جو انگلستان میں آج دی ٹائمز کو حاصل ہے۔''۴؎

سر سید احمد خاں نے اپنے صحافتی سفر میں کاغذ اور ٹائپ وغیرہ کا بھی خاص خیال رکھا تھا۔طباعت صاف ستھری اور حسین ہو ان تکنیکی باتوں پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی انھوں نے صحافت کے میدان میں اپنی کامیابی کا لوہا منوایا۔

ایک کامیاب صحافی بننے کے لیے اس کا دولت مند ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ذہنی استعداد، سچی لگن اور حوصلہ مندی اسے ایک کامیاب صحافی بناتی ہے۔سب سے اہم بات یہ کہ صحافت کا ایک مقصد ہو تبھی وہ اچھا، نڈر اور بے باک صحافی بن سکتا ہے۔اردو صحافت کی تاریخ میں بہت گنے چنے نام ایسے صحافیوں کے ہیں اور ان میں ایک اہم نام سر سید احمد خاں کا ہے جنھون نے نہ تو مذہب کے ٹھیکے داروں کی پرواہ کی اور نہ ہی حکومت کی بس اپنی صحافیانہ کوششوں سے لوگوں کی تشنگی کو بجھاتے رہے۔

حواشی

۱۔ڈاکٹر ساجد امجد۔مضمون سرسید۔ماہنامہ 'ہما' جے،۱۷،جنگپورہ ایکسٹنشن ،نئی دہلی۔دسمبر ۲۰۰۰ء۔ص۔۴۷
۲۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو،نئی دہلی۔۱۹۷۹ء۔ص۔۷۸
۳۔پروفیسر خلیق احمد نظامی۔سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔انجمن ترقی اردو ہند،نئی دہلی۔۱۹۹۶ء۔ص۔۳۰
۴۔عبدالحق۔مطالعہ سرسید احمد خاں۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،نئی دہلی۔۲۰۰۱ء۔ص۔۹۳
۵۔جے نٹراجن۔بھارتیہ پترکاریتا کا اتہاس۔پبلیکیشن ڈویژن حکومت ہند۔۲۰۰۲ء۔ص۔۶۵
۶۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو،نئی دہلی۔۱۹۷۹ء۔ص۔۶۵۔۶۴
۷۔محمد عتیق صدیقی۔ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ۔۱۹۵۷ء۔ص۔۲۷۸
۸۔ایضاً۔ص۔۲۷۸
۹۔نادر علی خاں۔اردو صحافت کی تاریخ۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔۱۹۶۷ء۔ص۔۱۳۲
۱۰۔محمد اسمٰعیل پانی پتی۔مقالات سرسید۔زریں آرٹ پریس،لاہور۔۱۹۶۲ء۔ص۔۷
۱۱۔ڈیوڈ وین رائٹ۔جرنلزم میڈ سمپل۔ روپا پیپر بیک،انصاری روڈ،دریا گنج،نئی دہلی۔ص۔۹
۱۲۔امداد صابری۔تاریخ صحافت اردو (اول) جدید پرنٹنگ پریس،دہلی۔۱۹۶۲ء۔ص۔۲۰
۱۳۔سید احمد قادری۔مضمون سرسید کی صحافت۔ماہنامہ تہذیب الاخلاق،علی گڑھ۔اپریل ۱۹۹۶ء۔ص۔۴۹
۱۴۔مشتاق حسین۔مکاتیب سرسید۔فرینڈس بک ہاؤس،علی گڑھ۔۱۹۶۰ء۔ص۔۴۶
۱۵۔ڈاکٹر سید عبداللہ۔مضمون،سرسید کا اثر ادبیات اردو پر۔علی گڑھ میگزین۔۵۵۔۱۹۵۴ء۔ص۔۷۰
۱۶۔منظر اعظمی۔اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔اترپردیش اردو اکادمی،لکھنؤ۔۱۹۹۶ء۔ص۔۲۴۰
۱۷۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں۔مکتبہ کارواں،لاہور۔۱۹۶۶ء۔ص۔۲۰۳
۱۸۔مختار الحق۔مضمون سرسید اور مسلمان۔تہذیب الاخلاق۔اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ص۔۶۱
۱۹۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں۔مکتبہ کارواں،لاہور۔۱۹۶۶ء۔۲۰۲
۲۰۔ڈاکٹر اصغر عباس (التماس بخدمت ساکنان ہند درباب ترقی تعلیم اہل ہند) سرسید کی صحافت۔انجمن ترقی اردو ہند،دہلی۔ ۱۹۷۵ء۔ص۔۵۲
۲۱۔ڈاکٹر ساجد امجد۔مضمون سرسید۔ماہنامہ 'ہما' جے،۱۷،جنگپورہ ایکسٹنشن ،نئی دہلی۔جنوری ۲۰۰۱ء۔ص۔۸۵
۲۲۔ڈاکٹر اصغر عباس۔سرسید کی صحافت۔انجمن ترقی اردو ہند،دہلی۔۱۹۷۵ء۔ص۔۵۳
۲۳۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو،نئی دہلی۔۱۹۷۹ء۔ص۔۱۲۵
۲۴۔مولوی عبدالحق۔مطالعہ سرسید احمد خاں۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،نئی دہلی۔۱۹۹۴ء۔ص۔۱۴۵
۲۵۔مولوی عبدالحق۔مطالعہ سرسید احمد خاں۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،نئی دہلی۔۱۹۹۴ء۔ص۔۱۴۸
۲۶۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو،نئی دہلی۔۱۹۷۹ء۔ص۔۲۹۷
۲۷۔ڈاکٹر اصغر عباس۔سرسید کی صحافت۔انجمن ترقی اردو ہند،دہلی۔۱۹۷۵ء۔ص۔۵۱
۲۸۔ایضاً۔ص۔۳۷

۲۹۔ پروفیسر فضل الرحمٰن۔ اردو انسائیکلو پیڈیا۔ جلد سوم۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ۱۹۹۷ء۔ ص۔ ۵۹۱
۳۰۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔ علی گڑھ۔ ۱۳رستمبر ۱۸۶۷ء
۳۱۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۲۵رمئی ۱۸۷۷ء
۳۲۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔ ۱۳رستمبر ۱۸۶۷ء
۳۳۔ مولانا حالی۔ حیات جاوید۔ ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی۔ ۱۹۷۹ء
۳۴۔ تہذیب الاخلاق۔ یکم رمضان ۱۳۱۴ھ
۳۵۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء۔ ص۔ ۱۸۷
۳۶۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۶۷
۳۷۔ جوزف آرڈومنیک۔ ڈائنامکس آف ماس کمیونیکیشن۔ میک گراہل پبلیکیشن، نیویارک۔ ۱۹۹۲ء۔ ص۔ ۱۱۴
۳۸۔ ڈاکٹر اصغر عباس۔ سرسید کی صحافت۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۱۰۰
۳۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۱۰۲
۴۰۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔ ۸رجنوری ۱۸۶۹ء۔ بروز جمعہ
۴۱۔ ایضاً
۴۲۔ ڈاکٹر اصغر عباس۔ سرسید کی صحافت۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۱۰۶
۴۳۔ قمر الہدیٰ فریدی۔ مضمون سرسید بحیثیت صحافی۔ مضمون تہذیب الاخلاق۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ص۔ ۴۲
۴۴۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔ ۲۲رستمبر ۱۸۷۶ء۔ جمعہ
۴۵۔ ایضاً۔ ار دسمبر ۱۸۷۶ء۔ جمعہ
۴۶۔ ایضاً۔ ۱۵رستمبر ۱۸۷۶ء۔ جمعہ
۴۷۔ قمر الہدیٰ فریدی۔ مضمون سرسید بحیثیت صحافی۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ص۔ ۴۶
۴۸۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۷۹ء۔ ص۔ ۱۸۶
۴۹۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔ ۳۰رمئی ۱۸۷۳ء
۵۰۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۱۱رستمبر ۱۸۸۰ء
۵۱۔ ڈاکٹر مسکین حجازی۔ اداریہ نویسی۔ مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص۔ ۲۹
۵۲۔ ڈاکٹر اصغر عباس۔ سرسید کی صحافت۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۱۹۷۵ء۔ ص۔ ۱۱۹
۵۳۔ سید اقبال قادری۔ رہبر اخبار نویسی۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء۔ ص۔ ۲۹۴
۵۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۱۷رمارچ ۱۸۷۶ء
۵۵۔ ایضاً۔ ۵رمئی ۱۸۷۶ء
۵۶۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۷رمارچ ۱۸۸۲ء
۵۷۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ ۲راپریل ۱۸۸۲ء
۵۸۔ ایضاً۔ ۹رستمبر ۱۸۸۲ء
۵۹۔ ایضاً۔ ۱۳رفروری ۱۸۷۴ء
۶۰۔ ایضاً۔ ۱۲ردسمبر ۱۸۸۲ء

۶۱۔حامد حسن قادری۔داستان تاریخ اردو۔عزیزی پریس،آگرہ۔۱۹۵۷ء۔ص۔۳۶۳
۶۲۔ڈاکٹر سید عبداللہ۔مضمون،سرسید کا اثر ادبیات اردو پر۔علی گڑھ میگزین۔۵۵۔۱۹۵۴ء۔ص۔۷۱
۶۳۔اخبار سائنٹفک سوسائٹی۔۷/اپریل ۱۸۶۷ء
۶۴۔ایضاً۔۱۰/مارچ ۱۸۶۷ء
۶۵۔ایضاً۔۲۷/اکتوبر ۱۸۶۷ء
۶۶۔ایضاً۔۲۷/اکتوبر ۱۸۶۷ء
۶۷۔ایضاً۔۹/اکتوبر ۱۸۷۴ء
۶۸۔ایضاً۔۱۵/ستمبر ۱۸۷۲ء
۶۹۔ایضاً۔۲۲/جنوری ۱۸۶۹ء
۷۰۔ایضاً۔۵/مارچ ۱۸۶۹ء
۷۱۔ایضاً۔۵/مارچ ۱۸۶۹ء
۷۲۔ایضاً۔۱۷/ستمبر ۱۸۶۹ء
۷۳۔ڈاکٹر اصغر عباس۔سرسید کی صحافت۔ص۔۲۲۹
۷۴۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں۔ص۔۲۱۸۔۲۱۹

سرسید احمد خاں کی صحافت کا سنگ میل: تہذیب الاخلاق

یوں تو سرسید احمد خاں سے پہلے ہی اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا اور ان کے عہد تک آتے آتے اردو صحافت ایک روایت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ لیکن علمی، ادبی اور جدید فکری نظریات و خیالات کا علمبردار بن کر ان کا پرچہ 'تہذیب الاخلاق' جب منظر عام پر آیا تو اردو صحافت نے ایک بالکل نئی راہ اختیار کی۔ تہذیب الاخلاق نہ صرف ایک پرچہ تھا بلکہ یہ ادبی حلقوں اور اس وقت کے تعلیم یافتہ طبقوں کے لئے اکبر کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ پرچہ نہ صرف صحافت کے بلند اور اعلیٰ معیار کا ترجمان تھا بلکہ ایک مقصدی اور اصلاحی رسالہ تھا۔ ان کے اس رسالے نے مسلم طبقے میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ہندوستانی مسلمان جو ہر طرف سے مغلوب ہو کر وقت کی گرد میں کھوتے جا رہے تھے ایک بار پھر نئے جوش و خروش کے ساتھ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس رسالہ کی یوں تو کئی ساری خصوصیات تھیں لیکن سب سے اہم بات اس میں یہ تھی کہ اس کے مضامین عام اور گھسے پٹے اخباری مواد سے مبرا ہوتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قوم کو گہرے ذہنی انقلاب کے لئے تیار ہونے میں مدد کرتے تھے جیسا کہ مولانا امداد صابری لکھتے ہیں۔

> ''تہذیب الاخلاق نے حقیقتاً علمی، مذہبی معلوماتی اور سیاسی مسائل سے لوگوں میں بڑی کایا پلٹ کی تھی اور سرسید نے اس اخبار کے ذریعہ اپنے خیالات سے علمی طبقے کو روشناس کرایا تھا اور تعلیم کی طرف توجہ دلائی تھی۔ تہذیب الاخلاق اپنے دور میں اپنا نظیر آپ تھا۔''[1]

اس رسالہ کا مقصد ہی قوم کی خدمت کرنا تھا۔ سرسید نے پورا ایک خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر رکھا تھا کہ کس طرح سے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان، سیاست کے میدان میں اور دوسرے شعبوں میں جہاں صرف انگریزوں اور دوسری قوموں کی اجارہ داری تھی بڑھایا جائے۔ سرسید نے ایک منظّم اور مصمم طریقۂ عمل کے ذریعہ اس اخبار کی شروعات کی اور ہندوستانی صحافت کو نیا عروج عطا کیا۔

☆ اغراض و مقاصد

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جب ناکام ہو گئی تو ہندوستانی مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے حالانکہ اس بغاوت میں برصغیر کی مختلف اقوام شریک تھیں لیکن مسلمان اس میں پیش پیش تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہی انگریزوں کے ظلم و مصائب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس ظلم و عتاب سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہی پہنچا اور نتیجے کے طور پر مسلم طبقہ معاشی تنگدستی، تعلیمی بے راہ روی، جاہلیت اور بے بسی و بے حسی کے ریگستان میں گم ہو گیا۔

> ''زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ میدان صحافت پر بھی غدر کے واقعے کا پورا اثر پڑا۔ غیر مسلم اخبارات نے مسلم اخبارات اور مسلمانوں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا۔ لاہور کرانیکل نے اپنی ۸ رجولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔ اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بغاوت کی تہہ میں مسلمانوں کی سازش کارفرما ہے انھیں شدید سے شدید سزا دینی چاہیے، کیونکہ یہ جب تک مسلمان ہیں اپنی رائے نہ بدل سکتے ہیں نہ بدلیں گے۔''[2]

لاہور کرانیکل کے علاوہ بنگال ہرکارو اور بمبئی ٹائمز نے بھی مسلمانوں کے خلاف اس تحریک میں حصہ لیا اور مسلم مخالف مضامین شائع کیے۔ نتیجے کے طور پر کئی اخبارات بند کر دیے گئے اور ان کے مدیروں کو سزا کا حقدار بھی ٹھہرایا گیا۔ اردو

صحافت کے نامور صحافی مولانا محمد باقر کو دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے قتل کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور بعد میں گولی ماردی گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی گرفتاری کے ڈر سے روپوش ہو گئے تھے۔ اردو صحافت پر غدر کے اثرات کا اندازہ جے نٹراجن کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اردو اخبارات کے تعلق سے کہی ہیں۔

''سنہ ۱۸۵۰، ۵۴۔۱۸۵۳ اور ۱۸۵۸ میں تیار کئے گئے اور شائع کیے گئے اخبارات کی فہرست کے جائزے سے کچھ دلچسپ حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۵۳ کی فہرست میں ۳۵ا خبارات کے نام ہیں جن میں سے ۱۵ نام ۱۸۵۰ء کی فہرست والے ہیں۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست کے مطابق اس وقت صرف ۱۲ اخبارات شائع ہورہے تھے جن میں سے صرف چھے اخبارات ۵۴۔۱۸۵۳ء والی فہرست کے ہیں۔ ان بارہ اخبارات میں صرف ایک اخبار کا مدیر مسلمان تھا۔''[۳]

جے نٹراجن کے اس قول سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اردو اخبارات دنوں دن کم ہوتے جارہے تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد یہ تعداد گھٹ کر ۱۲ پہنچ گئی تھی بلکہ یہ کہنا سچ ہوگا کہ اردو صحافت عملی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ غدر کے بعد کے اخبارات نے حکومت کی پابندیوں اور حکومت کے عتاب کی ڈر سے ایک اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کرلیا اور حکومت کے خلاف کسی بھی اخبار میں کوئی مضمون شائع ہونا بند ہو گیا۔ غدر کے بعد کے حالات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تاریکی اور گہری مایوسی لے کر آئے تھے وہ مغلوب و مظلوم ہو کر بے کسی اور لاچاری کی راہ میں بھٹک رہے تھے۔ اس سلسلے میں تاراچند لکھتے ہیں۔

''۱۸۵۷ء کی بغاوت نے جس کو پہلے جنگ آزادی بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی فکر پر گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ اس واقعے نے مسلمانوں کی نفسیات کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ ان کی سوچ و فکر کے دھارے آج بھی ان اندیشوں کے تابع نظر آتے ہیں جو کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے پیدا کئے تھے۔ چونکہ بغاوت کے بعد انگریزوں کی نفرت کا نشانہ مسلمان بن گئے اس لئے قدرتی طور پر بغاوت کے نتائج انھیں زیادہ برداشت کرنا پڑے۔ پورا مسلم فرقہ اندھیروں میں بھٹکنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی قسمت میں تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔''[۴]

مسلمانوں کو ایک نئی فکر سے ہم آہنگ کرنے اور ان میں جدید شعور بیدار کرنے کے لئے سرسید احمد خاں نے صحافت کا سہارا لیا اور اپنی سوسائٹی کے اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی شروعات کی۔ اسی درمیان سرولیم میور نے لائف آف محمد لکھی اور یہ کتاب ہندوستان بھی پہنچ گئی۔ سرسید احمد خاں نے اس کتاب کو دیکھنے کے بعد سوسائٹی کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ:

''ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی حقیقت عیسائی قوم پر ظاہر کی جائے اور غلطیوں کی نشاندہی کی جائے جو اس کتاب میں بانی اسلام کو سمجھنے میں کی گئی ہیں۔ ہائے ہائے اسلام وہ نہیں ہے جو اس مصنف نے سمجھا ہے۔ آپ لوگ گواہ رہیئے گا کہ اس کتاب کا جواب لکھنے کا ارادہ میں کر چکا ہوں۔ سرسید نے کتاب کا جواب لکھنے کے لئے اپنی کوششیں شروع کردیں لیکن انھیں جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ کافی مشکل اور دقت طلب کام ہے۔ انگریزی کتابوں سے مواد فراہم کرنا اور ان کے حوالے دینے کے لئے ایک انگریزی خواں کا ملازم رکھا۔ سب سے اہم مسئلہ کتابوں کی فراہمی کا تھا۔ جلد ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہ کئی پرائیوٹ کتب خانے تباہ ہو گئے تھے۔ جہاں یہ کتابیں مل سکتی تھیں۔ اب سرسید کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا کہ ولایت کا سفر کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا جائے۔ ولایت میں کافی دقتیں اور پریشانیاں تھیں لیکن کسی طرح سے انھوں نے ولایت جانے کا انتظام کیا اور اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ پہلی اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس کے ریلوے اسٹیشن سے بمبئی کے

لیے روانہ ہوئے جہاں سے انھیں لندن کے لیے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ بمبئی پہنچ کر دس اپریل کو لندن کے لئے انھیں جہاز میں جگہ مل گئی۔ تقریباً ایک ماہ بعد مختلف ممالک سے گذرتے ہوئے جہاز لندن پہنچا۔ لندن پہنچ کر سید احمد نے برٹش میوزیم لائبریری، انڈیا آفس کے کتب خانے اور دوسری لائبریریوں کا رخ کیا اور کتاب لکھنی شروع کر دی۔ ایک خط بعد مہدی علی کو لکھتے ہیں۔ ''میں شب و روز تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں سب کام چھوڑ دیا ہے، کمر درد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب ادھر فکر جواب اعتراضات، کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔'' ۵

جب سرسید احمد ہندوستان سے لندن کے لئے روانہ ہوئے تھے تو ایک اہم مقصد ان کے سامنے یہ تھا کہ لندن کے طریقہ تعلیم کو نزدیک سے دیکھا جائے۔ لہذا کتاب کے کام کو ختم کر کے انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کو جا کر دیکھا چھوٹی موٹی ساری باتوں کا مطالعہ کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اسی طرح کی یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے اس تعلیمی جائزے کی مدد سے انہوں نے ایک خاکہ مرتب کیا۔ ہندوستان کی انگریزی تعلیم سے اس کا موازنہ کیا اور لندن میں ہی ایک پمفلٹ انگریزی سے شائع کیا جس میں ہندوستانی طریقہ تعلیم کے نقصانات کا ذکر کیا گیا تھا۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال تبھی بہتر ہو سکے گی جب وہ انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہونگے۔ کتب خانوں کی چھان بین کے دوران انھیں ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر نام کے دو رسالے ملے۔ یہ رسالے ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری ہوئے تھے اور ان پرچوں کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کی تحریروں سے انگریزوں کے اخلاق و عادات، رسم و رواج اور دوسرے شعبوں میں انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ ان رسالوں کی اشاعت سے پہلے برطانیہ کی معاشی حالت ویسی ہی تھی جس طرح کے حالات سے ہندوستانی مسلمان گذر رہے تھے۔ یہی سب سوچ کر سرسید نے تہیہ کر لیا کہ ایسا ہی ایک رسالہ جو خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہوگا جاری کیا جائے جس میں مسلمانوں کے تعلق سے مضامین شائع کیے جائیں اور جو اخبار نہ ہو کر ایک رسالہ ہوگا۔ اس میں خبریں نہیں ہوں گی بلکہ تجزیاتی، انکشافاتی اور ترقیاتی خیالات شائع کیے جائیں گے جو ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی میں مفید ثابت ہوں گے۔

سر رچرڈ اسٹیل نے ۱۷۰۹ء میں ٹیٹلر کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس میں ایڈیسن کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ادارت کی ذمہ داری اسٹیل نے لے رکھی تھی۔ اس رسالے کا مقصد تھا انگلستانیوں کی زندگی اور ان کے خیالات و عادات میں تبدیلی لائی جائے اور انھیں کامیابی سے ہمکنار کیا جائے۔ لوگوں کو عیب اور جھوٹی شیخی کو دور کر کے حقیقی عظمت اور بہتر طور طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ ۱۷۱۱ء میں ٹیٹلر کی اشاعت بند ہو گئی۔ اس کے بعد سر رچرڈ اسٹیل اور ایڈیسن نے مل کر ایک دوسرا رسالہ نکالنا شروع کیا جس کا نام انھوں نے اسپیکٹیٹر رکھا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کے مضامین بھی اخلاقی اصلاح اور قوم کی ترقی سے متعلق ہوتے تھے اور برطانیہ کے لوگوں نے ان دونوں رسالوں سے کافی فائدہ اٹھایا اور ایک نئے عروج کی طرف گامزن ہو گئے۔

''ایڈیسن کی تحریروں سے بالتخصیص، طرز عبارت بہ نسبت پہلے کے بہت زیادہ صاف و شستہ، سلیس اور نہایت دلچسپ ہو گئی اور درحقیقت ایڈیسن کی تحریر سے انگریزی زبان کے علم انشاء میں ایک انقلاب عظیم واقع ہو گیا۔ ان پرچوں کی بدولت ہی شاعروں کے خیالات اور اشعار کی خیال بندی نہایت عمدہ اور درست ہو گئی۔ لغو اور بے سرو پا مضمون اشعار سے خارج ہو گئے تھے اور ان کی بجائے پرتاثیر مضمونوں نے جگہ لے لی۔'' ۶

سرسید ان رسالوں سے کافی متاثر ہوئے اور اسی وقت ان کے دل میں ایسے ہی ایک رسالے کا خیال آیا۔ سرسید کے سامنے تین اہم کام تھے۔ مذہب کو عقل انسانی اور جدید فکر سے جوڑنا اور ۱۴۰۰ سال پہلے کے اسلام کو آج کی عقلیت اور سائنس

کے نظام سے ثابت کرنا دوسرا مقصد مسلمانوں کی سماجی اور معاشی اصلاح اور تیسرا کام مسلمانوں کو جدید تعلیم سے ہم آہنگ کرنا تھا۔اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے سب سے پہلا کام مسلمانوں کو ان تبدیلیوں کے لیے تیار کرنا تھا اور یہ تب ہی ہوسکتا تھا جب مسلمانوں تک اپنی بات کو پہنچایا جائے۔اس کام کے لیے ایک رسالے سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔ایک ایسا رسالہ جو مسلمانوں میں ایک تحریک پیدا کرے انھیں جوش سے بھر دے جیسا کہ برطانیہ کے لوگوں میں ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر نے کیا تھا۔مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی بقاء ان کا پہلا نقطہ نظر تھا۔پہلے انھوں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریزوں کو جنگ آزادی کی وجوہات بتائیں اور مسلمانوں کو انگریزوں کے وحشیانہ انتقام سے بچانے کی کوشش کی۔پھر مسلمانوں کی اصلاح کے لیے صحافت کے میدان میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔پہلے انھوں نے مسلمانوں میں جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت کا شعور پیدا کرنے کے لئے اخبار سائنٹفک سوسائٹی شروع کیا اس میں خبریں بھی ہوتی تھیں۔اس کے برعکس تہذیب الاخلاق کا مقصد مسلم معاشرے کی اصلاح تھا اور یہ رسالہ صرف اور صرف مسلم طبقے کے لیے تھا۔ہندوستان آنے سے پہلے ہی اخبار کے بارے میں اپنے خط میں یکم شوال ۱۸۷۰ء میں لکھا۔یہ خط محسن الملک کو لکھا گیا تھا۔

> ''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا تجویز کرلیا ہے اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے۔کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔''ے

اپنے لندن کے زمانہ قیام میں سرسید نے مغربی سماج اور ان کی خصوصیتوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔مشرق کے محدود تصورات کے بجائے مغربی آزادی رائے جدید علوم کا حصول،عورت اور مرد کی برابر کی تعلیم ،اجتماعی تصورات اور باہمی امداد، حصول ترقی کا جذبہ، مذہبی عقائد میں محض تقلید کے بجائے عقلی وعقلی دلائل کا استعمال ان سارے تصورات کو ہندوستانی سطح پر عام کرنے کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا رسالہ ہو جو مسلمانوں کی تمام تر پریشانیوں کا ازالہ کر سکے۔سرسید نے تہذیب الاخلاق کو محور بناتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم وترقی کی طرف رخ کرنے پر مجبور کردیا۔

☆ شروعات

سرسید ۱۲/اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس ہندوستان پہنچے اور ۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء کو انھوں نے تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ شائع کردیا۔تہذیب الاخلاق کو انھوں نے اسلامی مہینوں کے مطابق نکالا تھا۔پہلا شمارہ یکم شوال ۱۲۸۷ء کو منظر عام پر آیا۔

تہذیب الاخلاق کے پہلے ورق پر انگریزی میں The Mohammdan Social Reformer چھپا ہوتا تھا اور پھر اردو میں تہذیب الاخلاق چھپا ہوتا تھا۔پہلا شمارہ عید الفطر کے مبارک دن شروع کیا گیا۔ہر شمارے کی شروعات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی تھی۔اس کے بعد اطلاع کے عنوان سے پرچے کا مقصد بیان کیا جاتا تھا۔یہ اطلاع کی عبارت پہلے دور کے پرچوں میں تو نظر آتی ہے لیکن دوسرے اور تیسرے دور کے پرچوں میں نہیں ہے اور بغیر اطلاع کے ہی پرچے کی شروعات کردی گئی ہے۔اس کی عبارت میں بھی بعد میں جب ضرورت پڑی ترمیم واضافے کیے گئے۔تہذیب الاخلاق ماہ میں کبھی ایک بار کبھی دو بار اور کبھی کبھی تین بار نکلا کرتا تھا۔سرسید نے اس کے بارے میں پہلے ہی پرچے میں اطلاع کے کالم میں کہہ رکھا تھا کہ مضامین کے مطابق چھپا کرے گا۔ملاحظہ ہو۔

> ''جس قدر روپیہ بابیں اس پرچہ کے بطور چندہ خواہ بطور قیمت وصول ہو وہ کسی خاص شخص کی ملکیت ہوگا بلکہ اس پرچہ کے اجراء وترقی میں صرف کیا جاویگا۔مسلمانوں میں سے جو شخص ساٹھ روپیہ سالانہ پیشگی بطور چندہ دے وہ اس پرچہ کے متعلق معاملات میں ممبر تصور ہوگا۔
>
> علاوہ اس کے جو شخص کچھ روپیہ بطور ڈونیشن دے وہ بشکر گذاری تمام لیا جاویگا۔یہ پرچہ ہر مہینے

میں ایک بار یا دو بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا۔ قیمت فی پرچہ دو آنہ اور مع محصول تین آنہ ہوگی مگر خریداروں کو کم سے کم تین روپیہ قیمت اور ایک روپیہ آٹھ آنہ پیشگی بھیجنے ہوں گے۔

اگر کوئی شخص کوئی خاص پرچہ خریدنا چاہے گا اس کو فی پرچہ چار آنہ قیمت اور ایک آنہ محصول دینا ہوگا۔ ممبروں کو بلا قیمت یہ پرچہ ملے گا اور ان کو اس کو تقسیم کا بلا قیمت جس کو چاہیں اختیار ہوگا۔ اس پرچہ میں بجز مضامین متعلق تہذیب الاخلاق وحسن معاشرت کے جہاں تک وہ مسلمانوں سے متعلق ہیں اور کچھ مندرج نہیں ہوگا۔''۸

چنانچہ شوال ۱۲۸۷ھ میں دو اور ذیقعدہ ۱۲۸۷ھ میں تین پرچے شائع ہوئے۔ محرم ۱۲۸۹ھ میں بھی یہ عبارت بعد میں کچھ تبدیل ہوگئی ہے اور بعد کے پرچوں میں اس طرح سے ہے۔ یہ تبدیلی آخری سطر میں کی گئی تھی۔

''اس پرچہ میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپہ ہوتے ہیں اور اس سبب سے اخبار امصار و دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچہ کے اجراء سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط العام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں۔''۹

تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ ۸ صفحوں پر مشتمل تھا اور اس میں سارے مضامین سرسید کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ پرچہ منشی محمد مشتاق حسین کے باہتمام شائع ہوا تھا۔ مشتاق حسین ۱۳۸۸ھ تک مہتمم رہے۔ اس کے بعد حافظ عبدالرزاق اور لالا گلاب نے اس کے مہتمم کی ذمہ داری سنبھالی۔ تیسرے دور میں ممتاز الدین کے زیر اہتمام مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپا۔

تہذیب الاخلاق کے پہلے ہی شمارے میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کرنے کی وجوہات بیان کی ہیں اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً ان باتوں کو دہرایا ہے۔

''اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے۔۔۔۔۔۔یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکتے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گر ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔''۱۰

اسی بات کو یکم رجب ۱۲۹۰ھ کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

''وہ پرچہ ہم نے اپنی دانست میں قومی تہذیب کے لیے جاری کیا ہے۔ پس جن مسائل مذہبی کے بحث کرنے کو ہم مناسب سمجھتے ہیں اور اس بحث کو تہذیب قومی سے کچھ تعلق جانتے ہیں اس کو مندرج کرتے ہیں اور ایسا ہی مضامین کا حال ہے کہ عام مضامین اس میں مندرج نہیں ہوتے اور مضامین خاص بھی وہی مندرج ہوتے ہیں جن سے اس کے بانیوں کی رائے میں لوگوں میں کسی قسم کی تہذیب کی ترقی متصور ہو۔''۱۱

اپنی اس بات کو سرسید نے آخری پرچے تک نبھایا اور صرف ایسے ہی مضامین شامل کیے جو کسی نہ کسی طرح مسلمانوں سے متعلق تھے۔ تہذیب الاخلاق کے فرائض کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا مضمون یکم رجب ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۹۴ء شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں عبدالحق نے تہذیب الاخلاق کے مقاصد کو بڑے ہی اچھے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ پیش ہے مضمون کا اقتباس۔

''سب سے پہلا فرض تہذیب الاخلاق کا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں نیشنلٹی کا خیال پیدا کرے اور جب تک یہ خیال ہماری قوم میں پیدا نہ ہوگا ہم کبھی اعلیٰ ترقی اور تہذیب کے رتبے تک نہیں پہنچ سکے۔''[12]

مولوی عبدالحق کی اس تحریر کے تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے پر انھیں علی گڑھ کالج سے سلور میڈل عطا کیا گیا تھا۔اس بارے میں طاہر مسعود لکھتے ہیں۔

''بابائے اردو کی اس تحریر کو اس زمانے میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔غالباً اسی مضمون پر مولوی عبدالحق کو لارڈ لینسڈ وں وائسرائے سلور میڈل عطا کیا گیا کیونکہ محمڈن کالج ڈائرکٹری میں میڈل ملنے کا سنہ۱۸۹۴اور بایں کے ذیل میں وجہ بیان کرتے ہوئے عمدہ جواب مضمون لکھنے پر تحریر کیا گیا ہے۔[13]

اس مضمون میں عبدالحق نے سرسید کے تیسری بار تہذیب الاخلاق شروع کرنے پر مبارک باد دی ہے اور اسے ہمیشہ جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا دور یکم شوال ۱۲۸۷ھ بمطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء سے لے کر یکم رمضان ۱۲۹۳ھ بمطابق ۲۰ ستمبر ۱۸۷۷ء ہے۔پہلے دور میں یہ پرچہ سات سال جاری رہا۔اس بارے میں سرسید نے لکھا ہے۔

''ساٹھ برس تک بذریعہ اس پرچے کے ہم نے قوم کی خدمت کی ہے۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جا رہی تھی اس سے خبردار کیا۔''[14]

اس بارے میں مولوی ذکاءاللہ کے مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو

''انھوں نے اس نیت سے کہ خیر محض تھی اس پرچہ کو جاری کیا۔یہ ایک اور بات ہے کہ وہ کسی کے نزدیک اسم با مسمیٰ ٹھیرا اور کسی کے نزدیک وہ تخریب الاخلاق بنا۔وہ سنہ ۱۳۰۱ نبوی سے سنہ ۱۳۰۷ نبوی کے آخر تک جاری رہا اور پھر بند ہوگیا۔اس سات سال کے عرصہ میں اس نے علم و نیکی اور نفع رساں کاموں کا شوق قوم میں پیدا ہوگیا۔(تہذیب الاخلاق۔شوال ۱۲۹۶ بمطابق ۱۳۱۰ نبوی)۔''[15]

مولانا الطاف حسین حالی نے پہلے دور کو چھ سال کا کہا ہے۔[16] عبداللہ خاں خویشگی نے پہلے دور کے آخری پرچے کی تاریخ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۶ء لکھی ہے۔جب کہ آخری پرچہ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۷ء کا ہے۔ممکن ہے کہ ۱۸۷۷ء تبدیل ہوکر ۱۸۷۶ء ہوگیا ہو۔عبدالسلام خورشید نے چھ سال سات ماہ لکھا ہے۔[17] لیکن حساب لگانے سے یہ صاف ہوجاتا ہے کہ پہلا دور ۶ سال ۹ ماہ کا رہا ہے۔سات سال پورے ہونے میں صرف تین مہینے ہی باقی تھے اس لیے سرسید نے سیدھے طور پر سات سال لکھا ہو۔

تہذیب الاخلاق کے پہلے دور کے مضامین کی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔حالی نے مضامین کی کل تعداد ۲۲۶ لکھی ہے۔[18] سید عبداللہ [19] اور عبدالسلام خورشید [20] نے بھی ۲۲۶ ہی لکھا ہے جب کہ عبداللہ خاں خویشگی [21] نے مضامین کی تعداد ۲۶۲ لکھی ہے۔جب کہ ڈاکٹر نفیس بانو [22] کی جدید تحقیق کے مطابق مضامین کی تعداد ۲۵۲ ہے۔میرے خیال میں حالی اور عبدالسلام خورشید کی لکھی تعداد ہی زیادہ معتبر ہے کیونکہ تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ ایک اطلاع سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کبھی کبھی غلطی سے مضامین پر غلط نمبر پڑ جاتے تھے۔یکم ربیع الاول ۱۲۹۰ھ کے تہذیب الاخلاق میں شائع یہ اطلاع ملاحظہ فرمائیں۔

''ہم افسوس کرتے ہیں کہ اہل مطبع کی غفلت سے ہمارے مضمونوں کے نمبر غلط چھپ گئے جن کی تصحیح ذیل میں کی جاتی ہے

نمبر ہائے غلط	نمبر ہائے صحیح	نمبر صفحہ
۱۲۸	۱۲۸	۲۰۰
۲۰۱	۱۲۹	۲۰۱

۲۰۲	۱۳۰	۲۰۳
۲۰۳	۱۳۱	۴
۲۰۴	۱۳۲	۱۰
۲۰۵	۱۳۳	۱۱
۲۰۶	۱۳۴	۱۴
۲۰۷	۱۳۵	۱۸
۲۰۸	۱۳۴	۲۰

اخیر پروف ہماری نظروں سے نہیں گذرتا افسوس ہے کہ بعض دفعہ مضمونوں میں بھی غلطی رہ جاتی ہے۔'' [۲۳]

ڈاکٹر نفیس بانو نے بھی اس سلسلے میں ذکر کیا ہے۔

'' پہلے دور میں ایک مضمون نقل خط کے عنوان سے ہے اور اس پر مضمون ۲۵۳ درج ہے جب کہ ۲۵۱ ہونا چاہئے تھا۔'' [۲۴]

پہلے دور میں سرسید نے کل ۱۱۲ مضامین لکھے تھے۔

ایک اہم بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہوں گا کہ تہذیب الاخلاق میں کبھی کبھی مراسلات، اطلاع، چندہ دینے والی کی فہرست، روئداد اور جلسے پر بھی مضمون نمبر لکھ دیئے ہیں۔ جو کسی بھی طرح سے مضامین کے زمرے میں نہیں رکھے جاسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ کا تہذیب الاخلاق جس میں مضمون نمبر ۱۴۲ میں چندہ مدرستہ العلوم مسلمانان، بغایت ۳۰ / اپریل ۱۸۸۳، چندہ جدید لکھا گیا ہے اور پھر چندہ دینے والوں کی ایک فہرست ہے۔ یہ کسی بھی طرح سے مضمون نہیں کہا جاسکتا ہے۔ تہذیب الاخلاق کی فائلیں دیکھنے سے ایک دوسری اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ کچھ مضامین یا مراسلات جو کسی خاص موضوع پر لکھے گئے ہیں ان پر کوئی نمبر ہی نہیں ہے جب کہ انہیں ہم مضامین کہہ سکتے ہیں۔

'' تہذیب الاخلاق یکم رمضان ۱۲۹۰ھ میں ''سکونت و تربیت طالب علمان مدرستہ العلوم'' کے عنوان سے ایک مسودہ قانون شائع ہوا تھا لیکن اس پر کوئی نمبر نہیں ہے جب کہ اس سے پہلے مضمون نمبر ۱۶۳ روئداد اجلاس پر مشتمل ہے اور یکم شوال ۱۲۹۰ھ میں ''سید مہدی علی کے لکچر'' پر مضمون نمبر ۱۶۴ دیا گیا ہے۔ کبھی ایسا بھی کیا گیا ہے کہ کوئی اطلاع یا خبر ہے اسے بھی مضمون نمبر کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

نمبر ۲۲

لندن میں عیدالفطر کی نماز

اب کی مرتبہ لندن میں بھی عیدالفطر کی نماز ہوئی امام اور مقتدی سب دس آدمی تھے حافظ احمد حسین صاحب سفیر جناب نواب صاحب بہادر سابق والی ٹونک نے نماز پڑھائی۔ مقتدیوں میں سید محمد محمود صاحب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر کے صاحب زادہ اور مرزا خداداد بیگ صاحب جو تحصیل علم کے واسطے لندن میں وارد ہیں اور لوگ شامل تھے۔ پس یہ ایک ایسی خبر ہے جس سے مسلمانوں کو خوش ہونا چاہیے۔'' [۲۵]

☆ دوسرا دور

دوسرے دور کی شروعات جمادی الاول ۱۲۰۶ھ، ۱۳۰۹ نبوی بمطابق ۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء میں ہوتی ہے۔ دوسرے دور کا آخری شمارہ رمضان ۱۲۹۶ھ بمطابق ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء کو منظر عام پر آیا۔

امداد صابری کے مطابق ایک سال سات ماہ کے تہذیب الاخلاق دوبارہ جاری ہوا تھا۔'' ۲۶

جب کہ عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ ''تین سال بعد یہ اخبار دوبارہ جاری ہوا۔'' ۲۷

جب کہ عبداللہ خاں ۲۸ خویشگی نے بھی اس وقفے کی میعاد تین ہی سال لکھی ہے۔

ڈاکٹر نفیس بانو لکھتی ہیں۔

''دور اول کے تین سال سات ماہ کے بعد دوسرا دور ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء تا ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء ہے۔ ۲۹

تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور کی میعاد دو سال تین ماہ ہوتی ہے۔ جب کہ عبدالسلام خورشید نے دو سال پانچ مہینے لکھا ہے اور عبداللہ خاں خویشگی سوا دو سال لکھتے ہیں۔

دوسرے دور کے کل مضامین کی تعداد ۶۷ ہے۔ جس میں سرسید کے ۲۳ مضامین ہیں۔ حالی کا مسدس مدوجزر اسلام بھی تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے دور میں اخبار اودھ پنچ سے منتخب شدہ مضمون ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا'' بھی شامل ہے۔

☆ دور سوم

تہذیب الاخلاق کے دوسرے دور کے خاتمے کے بارہ سال بعد دسمبر ۱۸۹۳ء کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آٹھویں اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولوی نذیر احمد نے پھر سے اس پرچے کو شروع کرنے پر کافی زور دیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کی ساری کوششیں ایک طرف اور تہذیب الاخلاق مرحوم ایک طرف۔ اس کے سڑیل سے سڑیل پرچے کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے عمدہ سے عمدہ پرچے سے مقابلہ کر کے دیکھو تو معلوم ہو کہ سرسید احمد خاں پہلے کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ میں پبلک میں سید احمد خاں کو تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کا الزام دیتا ہوں۔ تہذیب الاخلاق سرسید کے مشن کے مقاصد کے لیے اگر ضروری نہ تھا تو خود سرسید احمد خاں کا ہونا بھی ضروری نہیں۔ علی گڑھ کالج بھی ضروری نہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم اور رفاہ عام بھی ضروری نہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ہونا بھی ضروری نہیں۔'' ۳۰

نذیر احمد کی اس تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرسید نے تیسرے دور کے پہلے تہذیب الاخلاق میں ذکر کیا ہے۔ ''دوست کہتے ہیں کہ پھر تہذیب الاخلاق جاری کرو۔ ویسا ہی جیسا پہلے تھا۔'' ۳۱ تیسرے دور کے پہلے پرچہ میں نذیر احمد کا بھی مضمون ''تہذیب الاخلاق'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے اگر فی زعمی اور فی عمری کوئی قومی خدمت کی تو وہ یہ تھی کہ دسمبر ۱۸۹۳ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں ادب اور حفظ مرتبت کو بالائے طاق رکھ کر سرسید احمد خاں کو تہذیب الاخلاق کے بند کرنے پر خوب ہی

آڑے ہاتھوں لیا۔ واہ رے میں کہ میں نے ایسی جرأت کی اور واہ رے سرسید کہ دسمبر میں تہذیب الاخلاق کے پھر جاری کرنے کی ان کو رائے دی گئی اور ایک سہ ماہی نہ گذرنے دی کہ تہذیب الاخلاق پھر جاری کر دکھایا۔'' ۳۲

اس بارے میں مہدی علی نے بھی ایک مضمون بعنوان مرحوم تہذیب الاخلاق کا دوبارہ زندہ ہونا لکھا تھا۔ پیش ہے اس کا ایک اقتباس۔

''ہمارے مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے جو احسان اپنی فصیح و بلیغ تقریروں اور پرزور تحریروں اور بے نظیر لکچروں اور علمی اور اخلاقی اور مذہبی تصنیفوں سے قوم پر کیا ہے، وہ سب جانتے ہیں مگر تہذیب الاخلاق کا دوبارہ جاری کرانا بھی انھیں کا حصہ تھا۔ انھوں نے اب کے کانفرنس کے جلسہ میں اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانہ کر دیا کہ ہر شخص تہذیب الاخلاق تہذیب الاخلاق پکارنے لگا اور چاروں طرف سے اس کے دوبارہ جاری کرنے کا شور مچ گیا۔'' ۳۳

تہذیب الاخلاق کا تیسرا دور تین سال پر مشتمل ہے۔ تیسرے دور کی شروعات یکم شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۷/اپریل ۱۸۹۴ء سے ہوتی ہے اور آخری پرچہ یکم رمضان ۱۳۱۴ھ مطابق ۲/فروری ۱۸۹۷ء کو چھپا۔ اس طرح تیسرے دور کی میعاد تقریباً تین سال ہوتی ہے۔ آخری پرچے کے بعد تہذیب الاخلاق کا اپنا علیحدہ وجود نہیں رہا اور اسے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر لیا گیا اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام میں تہذیب الاخلاق کا اضافہ ہو گیا۔

تہذیب الاخلاق کے تیسرے دور کے کل مضامین کی تعداد ۱۴۵ ہے اور تین جلدوں میں چھتیس شمارے شائع ہوئے۔ تیسرے دور میں ۳۷ مضامین سرسید کے لکھے ہوئے تھے۔

☆ کچھ اہم خصوصیات

یہ رسالہ خالصتاً مسلمانوں کی ترقی کے لیے شروع کیا گیا تھا اور اس میں صرف مسلمانوں کے تعلق سے ہی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس پرچے کی سالانہ قیمت دور اول میں چار روپیہ، دور دوم میں ساڑھے چار روپئے اور دور سوم میں چھ روپئے تھی۔ مسلمانوں میں جو بھی ۶۰ روپئے سالانہ پیشگی دے دیتا تھا وہ ممبر بن جاتا تھا۔ ایسے ممبران کو یہ پرچہ بغیر اور کوئی قیمت ادا کئے تقسیم کر دیا جاتا تھا اور ممبران کو یہ بھی اختیار ہوتا تھا کہ وہ جس کو چاہیں پرچہ بانٹ سکتے ہیں۔ پرچہ پورے طور سے سرسید کی نگرانی میں تھا۔ خط و کتابت اور پرچے میں چھپے مضامین کے لیے ساری ذمہ داری انہیں کے نام تھی۔

دور اورل کے ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کے شمارے کے بعد سے درج ذیل عربی فقرہ پرچے کی شروعات میں درج ہوتا تھا۔

جب القوم من الایمان فمن یسع فی اعزاز قومه انما یعنی فی اعزاز دینه

قوم کی محبت ایمان کا جزو ہے جو شخص اپنی قوم کی سربلندی کی کوشش کرتا ہے دراصل اس نے اپنے دین کی سربلندی کی کوشش کی۔ اس بارے میں سرسید کی تحریر ملاحظہ ہو۔

''الحمدللہ کہ اس وقت بہ توجہ جناب منشی فضل عظیم صاحب مالک پنجابی اخبار کے ہمارے پاس ٹونس کا اخبار پہنچا جس کا نام ''الرائد التونسی تھے۔ اس کے پہلے فقرہ نے ہمارے دل کو شیدا کر دیا اور ہم کو اسی فقرہ سے

ایسا کامل قوم کی ترقی پر یقین ہو گیا کہ اگر دفتر کے دفتر پڑھتے جب بھی ایسا یقین نہ ہوتا اور وہ فقرہ جو اس اخبار کا ماٹو ہے یہ ہے۔ حب الوطن من الایمان فمن یسع فی عمران بلادہ انما لسعیٰ فی اعزاز دینہ بے اختیار ہمارے دل نے چاہا کہ ہم بھی اس ماٹو کو اس اخبار سے مانگ لیں اور چند حرفوں کی تبدیلی سے اس کو اپنے اس ناچیز پرچہ کا ماٹو اور اپنے دل کی صدا بنالیں۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور آئندہ سے مندرجہ ذیل فقرہ ہمارے اس ناچیز پرچہ کا زیب عنوان ہوا کرے گا۔ حب القوم من الایمان فمن یسع فی اعزاز قومہ انما یسع فی اعزاز دینہ۔''[۳۴]

سر سید احمد خاں نے جب پرچہ شروع کیا تھا تو ہرگز ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ پرچے میں مذہبی بحث ہوگی اور اسلامی مضامین ہوں گے۔ سر سید کے سامنے اسٹیل اور ایڈیسن کے پرچے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر تھے جن میں مذہبی بحث مباحثے نہیں ہوتے تھے لیکن ہندوستانی فضا اور یہاں کے مسلمانوں کے حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ ایسی بحثیں کرنی پڑیں۔ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں۔

''مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے کے بڑے بڑے مسائل اور اصول مذہب بحث میں آجاتے ہیں اور اس لیے لاچار کبھی ہم کو فقہ سے بحث کرنی پڑتی ہے اور کبھی اصول فقہ سے اور کبھی حدیث سے بحث کرنی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اسٹیل اور ایڈیسن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے زمانہ کے لوگ ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے اور قدر کرتے تھے اور ہماری یہ بدنصیبی ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے برخلاف کہا جاتا ہے اور ان کا پڑھنا باعث عذاب سمجھا جاتا ہے۔''[۳۵]

سر سید احمد خاں کو نہیں چاہتے ہوئے مذہبی بحث میں الجھنا پڑتا تھا کیونکہ جس طرح کے خیالات کو وہ عام کرنا چاہتے تھے وہ عام مسلمانوں کے عقائد کے خلاف تھے۔ تہذیب الاخلاق پورا کا پورا اردو میں شائع ہوتا لیکن جب تہذیب کی مکمل فائلیں دیکھیں تو پتہ چلا کہ کبھی کبھی یہ پرچہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا ہے۔ یکم ربیع الاول ۱۲۹۰ھ کے شمارے میں تدابیر ترقی مسلمانان کے نام سے طویل مضمون شائع ہوا ہے جو انگریزی میں بھی ہے۔ اسی طرح پندرہ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ کے شمارے میں روئداد اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ میں چندہ مدرستہ العلوم مسلمانان کے نام سے مضمون ہے جو انگریزی میں بھی ہے۔

تہذیب الاخلاق یوں تو ۸ اوراق میں شائع ہوتا تھا لیکن مضامین کے مطابق اس کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا اور کبھی ۱۰، ۱۲، ۱۶ اور کبھی ۲۰ اوراق میں چھپتا تھا۔ ہر ورق کے اوپر دائیں طرف ورق نمبر اور اس کے بھی دائیں اور بائیں دونوں طرف مضمون کا عنوان اور درمیان میں تہذیب الاخلاق اور اس کی تاریخ چھپی ہوتی تھی۔ دوسرے اور تیسرے دور کے پرچوں میں کچھ تبدیلی کی گئی اور مضامین کا عنوان نہیں دیا گیا لیکن باقی سارا کچھ ویسے ہی چھپتا رہا۔ الفاظ کی ساخت اور بناوٹ کو تبدیل کر کے چھوٹا کر دیا گیا۔ آخری ورق کے نیچے مطبع اور مہتمم کا نام لکھا ہوتا تھا۔ کچھ اہم اطلاعات دینی ہوتی تھیں تو وہ پرچے کے شروع میں 'اطلاع' کے عنوان دی جاتی تھیں اور کبھی کبھی یہ اطلاعات آخری ورق میں بھی دے دی جاتی تھی۔ تیسرے دور کے پرچوں میں سرورق EDITED BY M. ENAYATULLAH .B. A. چھپا ہوتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسرے دور میں سر سید دوسری مصروفیتوں کی بنا پر تہذیب الاخلاق کو زیادہ وقت نہیں دے سکے تھے۔ اسی درمیان سر سید تفسیر لکھنے میں مشغول تھے اور کالج کے معاملات کے ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد تھی۔ تیسرے دور کے مضامین زیادہ تر مذہب اور تفسیر اور تعلیم پر مشتمل ہیں۔

تہذیب الاخلاق کو سر سید نے اسلامی مہینوں کے اعتبار سے شروع کیا تھا اور ہجری کے ساتھ ساتھ نبوی سنہ بھی پرچے میں دیا

جا تا تھا۔اس بارے میں سرسید کا بیان ملاحظہ ہو۔

''ابتدا ہی سے ہمارا ارادہ تھا کہ ہمارا تہذیب الاخلاق سال نبوی کا حساب سے جاری رہے اور شوال سے ہی اس کا شروع سال ہو مگر ہم اس زمانہ میں نسبت اجرائے پرچہ تہذیب الاخلاق کے اپنے ایک مقدس سر گھٹے ٹخنے کھلے ماتھے پر گٹھ پڑے دوست کے دست بیع ہو چکے تھے۔انھوں نے نہ مانا اور کہا اجی حضرت یہ بھی کوئی بات ہے جو سنہ صحابہ کے وقت سے متفق علیہ چلا آتا ہے اور جس پر اجماع امت ہو چکا ہے اسی کو رکھنا چاہیے۔ نئے سال کی کیا ضرورت ہے۔لاچار ہمارا کچھ بس نہ چلا اور انھوں نے تہذیب الاخلاق کی جلدوں کے ٹکڑے کر دیئے۔پہلی جلد صرف تین مہینے کی رہ گئی۔ہم بھی وقت تک رہے تھے۔اب کہ تمام امور پرچہ تہذیب الاخلاق کے ہمارے ہاتھ میں ہیں اس لیے ہم اپنا قدیم ارادہ پورا کرتے ہیں اور یکم شوال روز عید سعید سے نئی جلد شروع کرتے ہیں۔''۳۶

سرسید کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سال نبوی کو سرسید نے بعد میں سرورق پر دینا شروع کیا اور شروع کے پرچوں میں صرف ھجری تاریخیں ہی نظر آتی ہیں۔

☆ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی نوعیت

تہذیب الاخلاق کی شہرت اس کے مضامین سے ہی ہوئی اور تہذیب الاخلاق کے مضامین نے معاشرے میں پھیلی بے جا رسوم اور فرسودہ روایات کے خلاف تحریک کا کام کیا۔ان مضامین میں زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات بھی نظر آتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوانے کی کوشش بھی کی،سیاست کے نقارے بھی سنائی دیتے ہیں اور عام مفلوک الحال زندگی کی سسکیاں اور آہیں بھی۔تہذیب الاخلاق میں مسلمانوں کی تعلیم کا رونا بھی ہے اور انگریزی حکومت کے ترانے بھی۔غرض کہ زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ بچا ہو جن پر مضامین نہ لکھے گئے ہوں اور تہذیب الاخلاق میں شائع نہ کیے گئے ہوں۔ ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں۔

''سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایسے شش جہت مضامین سموئے کہ یہ ہماری تمام جدید علمی،ادبی اور سماجی ترقیوں کا محور اور نثری ترقیوں کا مخزن بن گیا۔ مذہبی،قومی،اخلاقی،اصلاحی ہر قسم کے مضامین میں ندرت وجدت ودلکشی ورنگارنگی،فکر وتخیل،منطق وفلسفہ،جوش وخروش،متانت وجزالت اور شوخی وظرافت کا حسب موقع جلوہ نظر نواز ہوتا ہے۔''۳۷

ڈاکٹر مشتاق احمد کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔تہذیب الاخلاق کے شمارے اس کے گواہ ہیں کہ ان کے اوراق میں مسلمانوں کی مفلوک الحال اور بے منزل زندگی اور ان سے باہر نکلنے کی تجاویز نقش ہیں۔سرسید احمد خاں نے یوں تو ڈھیروں موضوعات پر مضامین قلم بند کیے لیکن ان سب کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح ہی تھی۔کچھ مضامین انگریزی حکومت پر بھی مشتمل تھے۔حکومت کی نوازشات یا روئداد یا پھر اجلاس اور لکچر کو بھی مضمون کی شکل میں قلم بند کیا گیا۔سرسید نے مذہبی واسلامی،تہذیبی ،سیاسی،تعلیمی واصلاحی،سائنسی اور ادبی مضامین لکھے۔سرسید کا تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ سب سے پہلا مضمون 'تمہید' کے عنوان سے ہے۔اس مضمون میں تہذیب الاخلاق کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے۔یہ مضمون سرسید کے اہم مضامین میں شمار کیا جاتا ہے۔پیش ہے ایک اقتباس

''اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحم دلی کو کمال کے درجہ پر پہونچانے والی ہیں مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم وعادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں

مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہوگئی ہیں چھوڑ نا چاہیے۔اب دونوں رایوں میں سے کسی ایک رائے کا
سچ کر کے دیکھا دینا۔مسلمانوں کے اختیار میں ہے اگر وہ اپنے عملی کاموں سے مثل اور دنیا کی مہذب
قوموں کے اپنے تئیں بھی مہذب کر دکھا دیں گے۔''۳۸

اس مضمون کے بعد رسم ورواج اور تعصب کے نام سے لکھا گیا سر سید کا مضمون ہے۔مضمون 'رسم ورواج' میں انھوں نے بے جا رسوم کی قیود سے آزاد ہونے کی آواز اٹھائی ہے۔

☆ مذہبی مضامین

سر سید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کو مذہب کے جال سے باہر آ کر عقلی سطح پر سوچنا چاہیے کہ وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔تعلیم ہی تمام ناکامیابیوں کا علاج ہے اور تعلیم حاصل کر کے ہی مسلمان اپنی منزل پا سکتے ہیں۔یہ نکتہ ان کے ذہن نشیں تھا۔تعلیم کے لئے ہمیں پرانی رسوم اور فرسودہ روایات کو ختم کرنا پڑے گا۔وہ دوسرے مغربی ممالک کی مثال دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں کہ وہاں مذہب کی قید نہیں ہے لیکن لوگوں نے جدیدیت اور مذہب میں ایک توازن قائم کرلیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج کامیاب ہیں۔سر سید نے اپنے مذہبی مضامین سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارا مذہب اسلام سچا ہے اور ہمیں اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہیے لیکن جہاں جدید تعلیم اور ترقی کی بات آتی ہے وہاں ہمیں اجتہاد کی ضرورت ہے۔اگر اسلام کا کوئی واقعہ یا معجزہ ہے تو اس میں تحقیق کرنے پر زور دیتے ہیں۔تہذیب الاخلاق کے مذہبی مضامین میں ہمیں پیغمبر اسلام محمد کے حالات زندگی خلفاء اربعہ کے حالات اور ان کے دور حکومت کے واقعات، امام غزالی وغیرہ اور مذہب کے چھوٹے چھوٹے معاملات مثلاً فاتحہ خوانی، کرامات، بزرگان دین، نماز، روزہ تمام باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اپنی باتوں کو ثابت کرنے کے لیے صحاح ستہ کی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں اور مختلف ائمہ کے قول کو ضرورت کے مطابق تحریر کرتے ہیں۔مذہب اسلام اور عورتوں کے حقوق، حدیث اور تقلید جیسے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں۔اس سلسلے میں سید احتشام حسین کا یہ قول یہاں دینا بے جا نہ ہوگا۔

''تہذیب الاخلاق میں سر سید کے مضامین پڑھتے جایئے۔آپ کو بار بار یہ خیالات واضح یا ڈھکے چھپے
الفاظ میں دکھائی دیں گے۔علم سے مراد علوم دینیہ نہیں ہیں محض روزہ نماز وغیرہ عبادت نہیں، جس طرح
علوم دینیہ کا پڑھنا فی نفسہ عبادت نہیں۔اسی طرح علوم دنیوی کا پڑھنا عبادت نہیں لیکن اگر علوم دنیوی اس
لئے پڑھے جائیں کہ ان سے مذہبی علوم کے سمجھنے میں مدد ملے گی تو ان کا پڑھنا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔
اس وقت مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امور معاش وتمدن وحسن معاشرت اور علم کی ابتری وخرابی کے سبب روز
بروز ذلیل وخوار ہوتے جاتے ہیں۔''۳۹

مذہبی مضامین میں جہاں سر سید اسلام پر قائم رہنے کی تلقین کرتے ہیں وہیں کبھی کبھی وہ انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو اسلام کے بالکل خلاف ہیں۔ان کی ایسی تحریروں میں ماضی کے کئی بڑے بڑے علماء سے انحراف نظر آتا ہے۔امام غزالی جیسی مقتدر شخصیت کے بارے میں سر سید نے اپنے طویل مضمون ''النظر فی رسالتہ الامام حجتہ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی'' میں جس طرح سے ذکر کیا ہے وہ کسی بھی طرح امام غزالی کے شایان شان نہیں ہے۔

''اس مقام پر تو امام صاحب نے اپنی تمام فضیلت اور امامت کو ڈبو دیا اور محض جاہلوں اور متعصبوں کی سی باتیں
لکھی ہیں۔۔۔۔ہم کو اس بات سے اس مقام پر بحث نہیں ہے کہ یہ تاویل صوفیہ کی صحیح ہے یا نہیں، بلکہ امام
صاحب نے جو فتویٰ کفر دیا ہے اس سے بحث ہے۔کفر کے فتوے کی بنیاد انھوں نے صرف اس بات پر رکھی

ہے کہ نعت وکلام عرب میں ان لفظوں کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔''۴۰

امام غزالی جیسی معتبر شخصیت کے بارے میں اس طرح سے لکھنا واقعی اپنے آپ میں ایک ہمت وجرأت کا کام ہے۔ ایسی تحریر اتنے عظیم مفکر کے بارے میں لکھنے کی کوشش سرسید کے علاوہ کوئی اور نہیں کرسکتا ہے اور جہاں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انھیں امام مانتا ہے۔ اس طرح کی تحریر سے ناراض ہو گیا اور سرسید کے خلاف زور آزمائی شروع کردی۔ اس بارے میں سید احتشام حسین کا یہ قول بالکل درست ہے۔

''ان کی (سرسید) ایک دشواری یہ بھی تھی کہ مذہب کے معاملہ میں قدیم علماء اور عوام تو ان سے بدظن تھے ہی وہ خود یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سیاسی مسائل کے حل کرنے میں مذہب سے کس طرح کام لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ ایک طرف تو وہابیت کے بعض پہلوؤں کو سراہتے تھے اور دوسری طرف یہ کہتے تھے کہ انگریز اہل کتاب ہیں۔ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اگر ہو سکتے ہیں تو وہ عیسائی ہیں یا دوسرے موقع پر ایک لکچر میں انگریزوں کا وفادار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسلمانوں کے محض عقلی اور انسانی نہیں، خدا کا حکم ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو۔ اس طرح عقل پرستی اور اجتہاد فکر نے وقتی مصالح سے ساز کر کے انھیں یہ بھی سکھا دیا کہ وہ مذہب کا سہارا لے کر غلامی کو حق بجانب ثابت کریں۔''۴۱

تہذیب الاخلاق کے مذہبی مضامین نے ایک طرح سے بغاوت کی فضا قائم کردی تھی اور وہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جسے علم حدیث اور فقہ کی معلومات تھی۔ سرسید کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ تہذیب الاخلاق نے ان کے ذہنوں پر برسوں سے لگے مذہبی پردے کو ہٹا دینے کی کوشش کی تھی۔ تہذیب الاخلاق میں یہ بات ہمیشہ کہی گئی کہ قرآن کا لہجہ تمثیلی ہے اور قرآن کی بہت ساری باتوں سے لوگوں نے غلط معنی اخذ کر رکھے ہیں۔ سرسید کا یہ بھی ماننا ہے کہ اتنی بڑی دنیا چھ دن میں نہیں بن سکتی کیونکہ عقلی اور سائنسی نقطہ نظر سے یہ غلط ہے۔ مسجد میں جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو سرسید نے مختلف روایتوں اور حوالوں سے ثابت کیا ہے اور کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کے وقت میں جوتا پہن کر نماز پڑھی جاتی تھی۔ ابراہیم اور نمرود کا واقعہ اور ابرہہ کے لشکر کے واقعے کو سرسید غلط مانتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مذہبی مضامین میں مختلف اسلامی عقائد سے انحراف کیا گیا اور کہا گیا کہ آج کے جدید دور میں ان باتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور عقلی سطح پر یہ باتیں سچ نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی باتوں سے بنیادی عقائد اور روایات کے ماننے والوں میں حشر برپا ہو گیا ہوگا اور تہذیب الاخلاق کی مخالفت کا سیلاب امڈ پڑا۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

''قصہ آدم کو، شیطان اور فرشتوں کو تمثیل قرار دیتے ہیں۔ جنت وجہنم کو استعارہ بتاتے ہیں۔ جزا وسزا ان کے نزدیک روحانی کیفیتوں کا نام ہے۔ حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کرنا، آسمان سے من وسلویٰ اترنا، فرعون کا دریائے نیل میں غرق ہونا، حضرت موسیٰ کا خدا سے ہم کلام ہونا اور ان کے عصا کا اژدہا بن جانا۔۔۔۔۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جنھیں سرسید ان کے ظاہری معنی میں قبول نہیں کرتے بلکہ ان سے وہ معنی اخذ کرتے ہیں جو قرین عقل ہیں۔''۴۲

لیکن یہاں سرسید کی ہمت وجرأت کی داد دینی پڑتی ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کا مقصد لے کر ان کے ذہنوں پر چھائے مذہبی اندھیرے کو دور کرنے میں انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مذہبی عقائد سے روگردانی کرنا اپنے آپ میں بہت ہمت کا کام ہے اور سرسید کی یہ ہمت کام آ گئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

''سرسید کی تصنیف کا ممتاز ترین موضوع مذہب ہے۔ اس پر ان کی بڑی کتابیں تفسیر القرآن اور تبین الکلام ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے تہذیب الاخلاق میں دینی

موضوعات پر لکھے۔ان سب کے مطالعے کے بعد سرسید کو اپنے زمانے کا بہت بڑا مذہبی مفکر تسلیم کرنا پڑتا ہے۔تفسیر القرآن اور تبین الکلام دونوں کے مطالب و مضامین سے شدید اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی تصانیف نے آنے والے دینی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔''۴۳

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے مذہبی اور اسلامی مضامین میں قرآن اور حدیث کے علاوہ اسلامی تاریخ سے متعلق مضامین بھی لکھے۔سرسید نے بھلے ہی مذہبی معاملات میں اجتہاد اور تحقیق پر زور دیا ہو لیکن ان کے مضامین پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی مسئلے پر کتنے مدلل اور کتنے گہرائی سے روشنی ڈالی ہے اور واقعی ان کے ان مضامین نے مسلمانوں پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔

☆ تہذیبی اور اصلاحی مضامین

تہذیب الاخلاق کا یہ سب سے اہم موضوع تھا کیونکہ پہلے ہی پرچے میں انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ مسلمانوں میں تہذیب اور سویلیزیشن لانے کے لیے اس پرچے کا آغاز ہو رہا ہے۔تہذیب کے تعلق سے کئی مضامین لکھے گئے۔کن کن معاملات میں تہذیب ضروری ہے اس پر زور دیا گیا۔کھانے پینے کے بارے میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی سرسید نے لکھا اور بنانے کی کوشش کی کہ ہر معاملے میں تہذیب نہایت ضروری ہے۔انسان کے خیالات،انسان کی عادات اور اس کے عقائد اس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔سرسید نے پہلے اپنے خیالات اور عقائد کو بدلنے کی تلقین کی۔جدید تعلیم حاصل کرنے سے پہلے مسلمانوں کو اس نئی تبدیلی سے ہم آہنگ کرانے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے فرسودہ خیالات کی تجدید کی جائے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز علم ہے جس کے معنی دانستن ہیں تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔''۴۴

سرسید کے مضامین اصلاحی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ان مضامین کو پڑھ کر مسلمان بھائی چارگی،قومی فلاح، مقصدیت اور ترقی کی طرف مائل ہوئے۔مسلمانوں کے اندر اجتماعی قوت کا احساس بیدار ہوا۔تہذیبی اور معاشرتی اصلاح پر مشتمل سرسید نے ۲۹ نکات پر مشتمل ایک منظّم پروگرام بنایا تھا۔اس پروگرام سے سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشے پر نظر رکھی تھی۔آزادی رائے، مذہبی عقائد کی درستگی، بے جا رسوم کی قیود سے آزادی، تعلیم نسواں اور روزمرہ کے آداب وغیرہ۔انھوں نے اپنے پروگرام میں جگہ دی تھی۔سرسید کا تہذیبی شعور کہیں کہیں مذہب سے آمنے سامنے نظر آتا ہے لیکن میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ جذبہ یقیناً مسلمانوں کی خیر خواہی کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں۔

''سرسید نے قیام انگلستان کے زمانے میں حاصل کی گئی نئی معلومات اور اسلامی تاریخ کے بعض غیر رسمی فکری رجحانات کی آمیزش سے اپنے لیے ایک جامع نظام فکر مرتب کیا۔اس نظام فکر میں اقدار کو زیریں لہروں کی طرح باقی رکھا اور برصغیر میں مسلمانوں کی اجتماعی عزت نفس کی بحالی کو اپنا بڑا مقصد قرار دیا۔یہی سبب ہے کہ سرسید کے تصور تہذیب کی اوپری سطح پر روحانیت اور اخلاقی اقدار کا ذکر کم ملتا ہے۔لیکن سماجی اور تہذیبی اصلاح کے ہر پہلو میں کہیں نہ کہیں اخلاقی اقدار کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سرسید مسلمانوں کو وسیع معنوں میں ایک مہذب انسان بننے کا مشورہ دیتے ہیں اور معاصر تہذیب کے

فیوض و برکات سے انھیں مستفید بھی کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ دنیا وی فلاح کے کسی بھی تصور کے نام پر عقیدہ اور ایمان کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔" ۴۵؎

تہذیب اور اصلاح پر پرچے میں برابر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ گذرا ہوا زمانہ میں وقت کی قدر کرنے کو کہتے ہیں اور اسی طرح بحث و تکرار کو نازیبا فعل قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

"جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے پر ہی خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔" ۴۶؎

تہذیب الاخلاق سے لیا گیا یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ سرسید کتنی چھوٹی اور معمولی بات کو کتنے اچھے انداز میں کہنے کا ہنر رکھتے تھے۔ خوشامد، جھوٹی تعریف و توصیف مہمان و میزبان اور عزت اور محبت وغیرہ موضوعات پر مضامین لکھے۔ سرسید کے علاوہ دوسرے مضمون نگاروں مہدی علی اور محسن الملک اور مشتاق حسین نے بھی اس طرح کے مضامین تحریر کیے ہیں۔ اصلاحی مضامین میں ہمیں ایک بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ بات کہنے کا لہجہ ایسا ہے جیسے کوئی بڑا انسان اپنے شاگردوں کو یا باپ اپنے بچوں کو نصیحت کر رہا ہے اور بتاتے وقت ان کا لہجہ محبت و شفقت سے لبریز ہے۔ اصلاحی مضامین پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جن سے مضمون نگار مخاطب ہے اگر وہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتا ہے اور اپنی عادات پر قائم رہتا ہے تو نصیحت کرنے والے کو مضمون نگار کو بھی دکھ پہنچے گا۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس۔

"اسی کے ساتھ مجھ کو ایک بڑا افسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگوں نے عزت کے معنی سمجھنے میں بھی بڑی غلطی کی ہے۔ انھوں نے عزت کے مفہوم کو چند ظاہری باتوں میں منحصر سمجھ رکھا ہے۔ خانگی امور میں تو اپنی عزت انھوں نے اس میں سمجھ رکھی ہے کہ دو چار خدمت گار دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہیں۔۔۔۔۔ اے میرے پیارے ہم قوموں اگر میرے لفظ ناگوار گذرے ہوں تو معاف کرو میرا دل اپنی قوم کے حالات پر نہایت جلتا ہے میں ان کو ایسی خراب حالت میں دیکھ نہیں سکتا اور جو ٹھیک ٹھیک حال ہے وہ نہایت دل سوزی اور ہمدردی اور دلی محبت سے سب کے سامنے رکھتا ہوں اس امید سے کہ ہماری قوم جاگے اور ہوشیار ہو اور اصلی عزت و دولت و حشمت میں پہنچے اور جس طرح کہ اس دنیا کی اور معزز قومیں معزز ہیں اسی طرح ہماری قوم بھی معزز ہو۔" ۴۷؎

سرسید کے اس طویل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کا کتنا درد ان کے سینے میں بھرا تھا اور اپنی اصلاحی تحریک سے جہاں تک ہو سکا۔ مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ تہذیب الاخلاق کے تہذیبی اور معاشرتی مضامین روزمرہ کی زندگی کے اصول اور اپنے خیالات کو بہتر بنانے کے طریقے بھرے پڑے ہیں۔ مہذب قوموں کی پیروی ہو یا سخاوت و گدائی سبھی عادات کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسری کامیاب قوم کی جو اچھی صفات ہیں انھیں اپنایا جائے۔ ان کی پیروی کی جائے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لیے ہر طرح سے مدد کی جائے اور سخاوت سے کام لیتے ہوئے ہر مسلمان کو آگے آنا چاہیے۔

تہذیب الاخلاق کے اصلاحی مضامین اس معاملے میں بھی اہم ہیں کہ ان مضامین نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کو جہالت کے اندھیرے سے تہذیب اور کامل درجے کی سویلیزیشن کے اجالے کی طرف لانے میں اہم کام کیا ہے۔ ایسے مضامین کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمان اگر انگریزوں اور مہذب قوموں کے درمیان بیٹھیں تو انھیں سبکی محسوس نہ ہو اور کہیں بھی انھیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اس طرح کے مضامین لکھ کر مسلمانوں کو پہلی بار

آداب زندگی کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں سے روشناس کرایا اور یہ تہذیب الاخلاق کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

☆ تہذیب الاخلاق کے دوسرے مضامین

تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ دونوں میں تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم و ترقی سرسید کی کوششوں کا محور تھی۔ تہذیب الاخلاق میں بھی تعلیمی مضامین کافی شائع ہوئے۔ جہاں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جدید تعلیم حاصل کرنے کو غلط کہتا تھا وہیں سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانوں کی ترقی کی پہلی منزل بنایا۔ انگریز حکومت سے سامنا کرنے کے لیے ضروری تھا ان کے قدم سے قدم ملا کر چلا جائے اور یہ تبھی ہو سکتا تھا جب مسلمان جدید تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ ہر انسان وقت کے ساتھ ساتھ کامیابی اور ناکامی سے ہم کنار ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے وقت کی رفتار اسے زندگی جینے کا سلیقہ عطا کر دیتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ آخری سفر پر روانہ ہونے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں احساس ہوتا ہے کہ زندگی میں کیا کیا اور کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ شاید سرسید کو اس آخری وقت کا بہت پہلے سے احساس تھا اور انھوں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے گا قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرونگا اور اس میں سرسید کو کامیابی بھی ملی۔

تہذیب الاخلاق کے تعلیمی مضامین میں مذہب اور عام تعلیم، جدید تعلیم مدرستہ العلوم وغیرہ پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ نظامیہ سلسلہ تعلیم کے عنوان سے لکھے مضمون میں قدیم تعلیمی نظام کو تبدیل کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس مضمون میں مسلمانوں کے دور میں قائم تعلیمی نظام کا ذکر کیا گیا ہے اور بعد میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس تعلیمی نظام کو ختم کر کے جدید تعلیمی سلسلے کو شروع کیا جائے۔ یہ جدید تعلیمی سلسلہ موجودہ دور سے مطابقت رکھتا ہوگا اور مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم اور ترقی میں معاون اور سودمند بھی ثابت ہوگا۔ مضمون میں مثال دے کر سمجھایا گیا ہے کہ فقہ اور حدیث کی کتابیں جو کافی قدیم ہیں ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں کافی دقت آتی ہے اور اب نئے سرے سے وقت اور حالات کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مضمون 'علم اور اس کی تحصیل کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رجوع کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ محمد عنایت الرحمٰن کے لکھے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غربت کی وجہ سے تعلیم نہیں حاصل کر سکتے وہ غلطی پر ہیں۔ پیش ہے یہ اقتباس

> ''پس اب اس زمانے میں جو کہ زمانہ سابق سے بدرجہا ترقی پر ہے اگر کوئی کہے کہ تحصیل علم ناممکن ہے تو یہ بات کیونکہ عجیب نہ معلوم ہو اب اس زمانے میں تحصیل علم کے واسطے صرف ہمت شرط ہے جب کہ اگلے زمانوں میں غریب سے غریب لوگوں نے علم حاصل کر لیا تو اب تو بہت آسان ہے۔ پس اب مسلمان بھائیوں کو لازم ہے کہ پست ہمت بنوں اور علم کی تحصیل میں مصروف ہوں بعد ازاں دیکھیں کہ کیا عزت اور کیا فائدہ ان کو حاصل ہوتا ہے اور اس خیال کو کہ بباعث افلاس تحصیل علم ناممکن ہے دور کریں۔'' ۵۰

تعلیم و تربیت کے علاوہ تعلیم کے لیے بہتر ماحول بنانے پر زور دیا گیا تاکہ ایک صاف ستھرے معاشرے کی تعمیر ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ مدرسے اور تعلیمی مراکز کے قیام سے متعلق بھی مضامین شائع ہوئے۔ مدرستہ العلوم کے قیام اور اس کی تعلیمی صورت حال اور تعلیمی نکات پر بھی مضامین تہذیب الاخلاق کی زینت بنتے تھے۔ تعلیمی مضامین کے علاوہ سائنسی، تاریخی مضامین بھی کافی شائع ہوئے۔ سائنسی مضامین میں تو سرسید نے کئی باتیں اتنی تفصیل اور تحقیق سے بیان کی ہیں کہ جیسے انھوں

نے سائنس کی کئی گتھیاں سلجھا رکھی تھیں۔ ملاحظہ ہو ان کے مضمون ''دنیا کب بنی اور کتنی مدت میں'' سے ایک اقتباس:

''علم جیالوجی میں ہر ایک طبقہ کی بناؤں کا علیحدہ علیحدہ زمانہ قائم کیا ہے۔ اس کی رو سے زمین کے کل طبقات جو اس بھڑکنے والے شعلے کے اوپر بنے ہیں جو زمین کے بیچ میں ہے بیس کروڑ برس کے عرصہ میں بنے ہیں اور اس حساب سے آج سے بیس کروڑ برس پہلے دنیا کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس کی تعداد کہ وہ آفتاب کا بھڑکتا ہوا شعلہ جس سے ٹوٹ کر زمین بنی ہے کب سے تھا خدا کے سوا کس کو معلوم نہیں۔

علامہ ابن حزم نے جو یہ بات لکھی ہے کہ دنیا کی کتنی ہی عمر تحقیق ہو اسلام کے کچھ مخالف نہیں ہے اس کو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر دراصل اس بات کو بیان کرنا ہے کہ قرآن مجید میں چھ دن میں دنیا و مافیہا کا بننا بیان ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے اور جب تک اس کا مطلب نہ بیان کیا جاوے قرآن مجید و تحقیقات علوم جدیدہ میں مطابقت کا ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ سید احمد۔'' ۵۱

اس مضمون کے اقتباس سے سرسید کی قابلیت اور سائنس سے دلچسپی جھلکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اندر تحقیق اور جستجو کا جذبہ بھی تھا اور انھوں نے اپنے علم اور مطالعے کی بنیاد پر اس مضمون کو تحریر کیا اور تصاویر کے ذریعہ دنیا کے بننے کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس جستجو نے ان کے دل و دماغ پر ایک پردہ سا ڈال دیا تھا۔ یہاں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا تحریر کر کے قرآن شریف اور اللہ کے کلام سے انکار کر رہے ہیں۔ ایک طرف اس بات کا بھی اقرار ہے کہ غیب کی باتوں کا خدا کو علم ہے لیکن دوسری طرف خدا کے مقدس کلام کے انکاری ہیں۔ خدا کے کچھ معاملات تو خدا ہی بہتر جانتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ اسے انسانی عقل اور سائنس کے ترازو میں تول کر دیکھا جائے۔ اسی طرح سے وہ واقعہ معراج اور ابراہیم ونمرود کے واقعات سے انکار کرتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق کے سائنسی مضامین میں کچھ مضامین مثلاً مسمریزم، علم کیمیا، نیچرل سائنس کے عجائبات، اسلام کی دنیوی برکتیں، علم ہیأت کے چٹکلے، ہربرٹ اسپنسر کی فلاسفی وغیرہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی ایک سائنسی تصویر پیش کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم کوئی سائنسی رسالہ پڑھ رہے ہیں۔ پیش ہے مولوی عنایت اللہ کے ایک مضمون سے یہ اقتباس۔

''چاند کسی زمانہ میں زمین کا ایک ٹکڑا تھا اور وہ اس وقت جب کہ زمین مشتعل تھی اس سے ٹوٹ کر جدا ہو گیا تھا اور اس کے گرد چکر کاٹنے لگا اب وہ بالکل سرد اور مردہ ہے، لیکن اس زمانہ میں اس کی سطح سے شعلوں کے طوفان اور آگ کے مینہہ زمین پر برسا کرتے تھے جب کہ کشش ثقل اس کے جسم کی صورت اور اس کے دورہ کرنے کے راستہ کو درست کرتی رہتی تھی تو ہزاروں برس کے عرصہ میں اس نے اپنی حدت کو رفتہ رفتہ صرف کر ڈالا اور آخری کار سرد مزاج اور زرد صورت کا بن گیا۔ ہماری راتیں اس سے روشن ہوتی ہیں لیکن یہ روشنی ہلکی اور ٹھنڈی ہوتی ہے کیونکہ اس کی شعاعیں وہ ہوتی ہیں جو آفتاب سے اس کو ملی ہیں اور بعد میں ان کی روشنی ہم تک پہونچتی ہے۔ ستاروں کے مقابلے میں جو ہمارے کرہ سے بے انتہا دور ہیں چاند کے فاصلے کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہم سایہ ہے اور ہماری آنکھیں اس کی تمام چیزوں کو اس طرح دیکھ سکتی ہیں کہ گویا وہ ہم سے چھوٹا ہے۔ ۵۷

یہ وہی مولوی عنایت اللہ ہیں جنھوں نے تیسرے دور کے تہذیب الاخلاق کی ذمہ داری سنبھالی تھی اور تہذیب الاخلاق کے سرورق پر بھی ایڈیٹر محمد عنایت اللہ لکھا ہوا ہے۔ ان دنوں سرسید احمد خاں علی گڑھ کالج اور قرآن کی تفسیر پوری کرنے میں مصروف تھے۔ محمد عنایت اللہ کے اس مضمون میں بڑی تفصیل سے چاند، سورج اور دنیا کی پرتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ

مضمون ان کے علم کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور سب سے بڑھ کر مضمون کے سادہ اور عام فہم اسلوب نے اس کی خوبصورتی دوبالا کردی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم کوئی سائنسی مضمون نہ پڑھ کر کوہ قاف کی سیر کررہے ہیں اور یہ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ تہذیب الاخلاق کے سائنسی مضامین کی بھی اپنی الگ خاصیت ہے۔ کبھی اسلامی تاریخ کا ذکر ہے تو کبھی علوم وفنون کی تاریخ اور کبھی کسی مفکر ومصنف کا تاریخی انداز میں مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مولانا قاسم نانوتوی وغیرہ کے حالات زندگی کو تفصیل سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کا مسلک اور ان کا مکتبہ فکر صاف صاف ظاہر ہوجاتا ہے۔ قومی اور سیاسی مضامین اور اردو ادب کے تعلق سے بھی مضامین تہذیب الاخلاق میں ملتے ہیں۔ سیاسی مضامین میں مسلمانوں کی تعلیم کے تعلق سے انگریزی حکومت کا رویہ بیرون ممالک میں سیاست اور مسلمانوں کو حکومت کا وفادار بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین نے مسلمانوں کو ایوان سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور سب سے پہلے انگریزوں کے ہم قدم ہونے کی درخواست کی۔ قومی مضامین میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ دونوں ہندوستان کی ایک قوم ہیں اور ہندوستان ان کے دم سے ہے۔ ادبی مضامین میں شعروشاعری، شاعروں کے حالات وغیرہ کا بیان ہے اردو زبان کے ارتقا پر بھی مضمون ہے۔ صنف انشائیہ، سرسید کے انشائیہ سے اور پھلی پھولی اور ان کے انشائیے 'امید کی خوشی'، 'گذرا ہوا زمانہ' آج بھی زبان زد عام ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔

> ''سرسید کا ذوق ادب ایسا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑ جائے تو اردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے اب بھی اگر ان کی ضخیم تصانیف اور بے شمار تحریروں میں سے صرف ادبی نقطہ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان وادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔'' ۵۸

مولوی عبدالحق کی اس بات سے یکسر انکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ کہنا اور زیادہ صحیح ہوگا کہ سرسید آج بھی اردو کے بہت بڑے ادیب ہیں اور اردو زبان وادب کو تہذیب الاخلاق سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ مختلف موضوعات پر ایسے مضامین جو اردو میں دستیاب نہیں تھے۔ پہلی بار تہذیب الاخلاق کے ذریعہ لوگوں تک پہنچے۔ حکومت کی کئی پالیسیاں جو عام لوگ نہیں جانتے تھے وہ تہذیب الاخلاق کا بہت بڑا کردار رہا۔ اس کے علاوہ اتنی عام فہم زبان میں لوگوں تک بات پہنچائی گئی جس میں لوگ بات چیت کرتے ہیں اس سے زبان کا فائدہ ہوا اور عام فہم اسلوب رائج ہوا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین پڑھتے ہوئے بس ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمیں کوئی ماں پیار سے سمجھا رہی ہے۔ شفقت سے ڈانٹ رہی ہے یا پھر مشفق استاد سائنس کی گتھیاں سلجھا رہا ہے۔ غرض یہ کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین نے ابتدا سے بڑھ کر انقلاب برپا کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے ایک نیا ذہن دیا۔ تہذیب الاخلاق کی شکل میں مسلمانوں کو ایک نیا مصلح ملا جس نے سچ مچ مسلم قوم کی اصلاح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

> ''سرسید کے مضامین معاشرتی زندگی کے بہت سے اہم جہات کی سچی اور پراثر تصویریں ہیں اور ان تصویروں میں سرسید کی ژرف نگاہی اور تاریخی حسیت نے ذہنی بیداری اور اصلاح کے جو رنگ بھرے ہیں ان کی چمک آج بھی مدھم نہیں ہوئی۔ سرسید آرائشی اور مصنوعی تہذیب کے بجائے زندہ اور صحت مند تہذیب کا شعور رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔ سرسید کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری سماجی زندگی کو اس وقت جھنجھوڑا جب بیداری کا تصور سیاسی رہنماؤں اور ناخداؤں کے ذہن میں پوری طرح ابھرا نہیں تھا۔ سرسید کی اولیت اسی میں ہے کہ انھوں نے ہندوستان سیاست کو ایک ایسے نئے موڑ سے آشنا کیا جس سے ہوکر بعد میں سیاست کے بہت سے کاروانوں نے اپنی منزل متعین کی۔ ۵۹

تہذیب الاخلاق کے مضامین کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ اس کے مضامین کے بعد ملک میں ایک خالص

علمی اورادبی تصور عام ہوا جس سے مسلمانوں نے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش شروع کردی اوران کے نقطہ نظر میں بھی تبدیلی آئی اورقوم کے تقریباً سبھی شعبہ حیات میں اس کے اثرات دیکھے گئے۔

☆ تہذیب الاخلاق اور اردو صحافت

تہذیب الاخلاق نے جہاں زندگی کے ہرشعبے پراثر ڈالا وہاں اردوصحافت بھی اس سے اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔تہذیب الاخلاق ایک اخبار نہ ہوکر جریدہ تھااوراس میں خبریں نہیں ہوتی تھیں بلکہ علمی اوراصلاحی مضامین ہوتے تھے۔یہ مضامین بھلے ہی اخباریت سے عاری تھے لیکن پھر بھی صحافت کے پیمانے پر کھرے اترتے ہیں۔کوئی بھی تحریر چاہے وہ جلدی میں لکھی جائے یا محنت سے لکھی جائے ایک مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی ہے۔ہرتحریر کا ایک مقصد ہوتا ہے کہ اسے دوسرے دیکھیں پڑھیں اوراس تحریر سے مستفید ہوں اور لکھنے والے کے تجربات اور بیانات سے پڑھنے والوں کو بھی فائدہ پہنچے۔اسی بات کو سید اقبال قادری کہتے ہیں۔

> ''فکری تانے بانے لے کر یا چند حقائق کے ساتھ یا اپنے احساسات اور جذبات سمیت ہر لکھنے والا اپنی دماغی کاوش کا نتیجہ قلم کی مدد سے کاغذ پر منتقل کرتا ہے اوراس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس کے قلم سے سادہ صفحہ پر لکھا جارہا ہے وہ دیگر نظروں سے ضرور گذرے گا۔لکھنے والا یہ جانتا ہے کہ اس کی تحریر کا اثر براہ راست یا بالراست دیگر دلوں اور دماغوں پر ہونے والا ہے۔''۶۰

سرسید احمد خاں نے بھی صحافت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے رسالے کو ترتیب دیا اوراردوصحافت کی تاریخ میں اپنا نام سنہرے الفاظ میں لکھوالیا۔برنارڈ شا کا مشہور مقولہ ہے۔اعلیٰ ادب اور بلند پایہ ادبی شہہ پارے درحقیقت صحافت ہیں۔All I great literatures are journalism۔برنارڈ شا کے اس بیان کی روشنی میں اگر ہم سرسید کی تخلیقات خاص طور سے تہذیب الاخلاق میں شائع شدہ مضامین کا جائزہ لیں تو احساس ہوگا کہ جہاں ان مضامین کو بلند پایہ ادبی حیثیت حاصل ہے وہاں صحافتی نقطہ نظر سے بھی یہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

صحافت کا سب سے پہلا اصول ہے کہ تحریر عام فہم ہو اور کم پڑھا لکھا انسان بھی آسانی سے سمجھ سکے۔اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالوں کی بھی یہ خاص بات تھی کہ ان کی تحریر میں الفاظ کی شعبدہ بازی نہیں ہے بلکہ تحریر کا خیال سب سے اہم چیز ہے۔الفاظ کو ترسیل یا پیغام کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک ایک لفظ کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے۔ان تحریروں کو ہی سامنے رکھ کر سرسید نے بھی عام فہم زبان میں تحریریں تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا۔سرسید کا یہ اسلوب تحریر اردوصحافت کی تعمیری نثر میں شمار کیا جاسکتا ہے۔سرسید کا یہ صحافتی انداز اردوصحافت میں آگے چل کر ایک نئے عہد کی شروعات ہے۔سرسید کی عام فہم نثر نے اردوصحافت کو نیا مقام عطا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔عابد صدیقی نے لکھا ہے۔

> ''صحافتی مضامین حالات اورواقعات کے اظہار کا نام ہی نہیں بلکہ وہ ان افکار وخیالات کا بھی اظہار کرتے ہیں جنھوں نے ان واقعات کو جنم دیا ہے۔صحافت حقائق سے راست طور پر آگاہی کا نام ہے۔صحافتی مضامین کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سچائی،صداقت،صاف گوئی،آسان زبان وبیان الفاظ کے کم استعمال اور غیر مبہم خیالات پر مبنی ہوں۔ایسی تحریریں جو خیال کو واضح نہ کرسکیں صحافت میں شامل نہیں ہیں۔تحریر میں چستی روانی اور بے ساختگی مواد کی کثرت بہترین صحافت کے معیارات ہیں۔''۶۱

عابد صدیقی کے اس اقتباس کے بعد اگر سرسید کے مضامین کا جائزہ لیں تو صاف طور سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین میں نہ تو ہمیں غیر مبہم خیالات ملیں گے اور نہ ہی ایسی تحریریں جو خیال کو واضح نہ کرسکیں۔صحافت میں یہ صحیح

ہے کہ خبر News کو سب سے اہم مقام دیا جاتا ہے لیکن اگر بین الاقوامی اخباروں پر نظر ڈالی جائے تو احساس ہوگا کہ News سے زیادہ اہمیت Views کو دی جاتی ہے۔ سرسید نے بھی اسی نکتے کو ذہن میں رکھا اور خبروں سے زیادہ اہمیت خبروں کے تبصرے کو دی۔

آج کے اردو اخبارات بھلے ہی صحافت کا اعلیٰ معیار پیش کر رہے ہوں لیکن ان اخبارات کا کوئی واضح مقصد یا واضح نقطہ نظر نہیں ہے۔ جب کہ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچے میں اپنے رسالے کے جاری کرنے کی وجوہات بتائی ہیں۔

> ''بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے مسلمانوں کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتی ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔'' ۶۲

یہی نہیں بلکہ تہذیب الاخلاق کے تینوں ادوار میں مختلف موقعوں پر انھوں نے پرچے کی مقصدیت واضح کی اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے تعلق سے آرٹیکل شائع کیا۔ یکم محرم ۱۲۸۹ھ کے پرچے میں لکھتے ہیں۔

> ''ہمارے اس پرچہ کی عمر سوا برس کی ہوئی اور ترسٹھ مضمون اس میں چھپے اب ہم کو سوچنا چاہیے کہ ہم کو اس سے قومی ترقی حاصل ہونے کی کیا توقع ہے۔'' ۶۳

اس طویل مضمون میں انھوں نے پھر سے تہذیب الاخلاق کے مقصد کو واضح کیا ہے اس مضمون کا خاتمہ اس تحریر سے کرتے ہیں۔

> ''ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم اس مکین پرچے کے ذریعہ سے ہندوستان میں وہ کچھ کریں گے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں کیا بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے۔ ہم اپنا فرض پورا کرتے ہیں واللہ در من قال السعی منّی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔'' ۶۴

سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعہ صحافت کو ادب سے روشناس کرایا اور ان کے درمیان کی دوری کو کم کر دیا۔ سرسید کی تحریریں اردو صحافت کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق نے صحافت کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔ آج تک اردو کا کوئی دوسرا رسالہ اس معیار کو نہیں پہنچا۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

> ''دراصل تہذیب الاخلاق ہی وہ رسالہ ہے جس نے اردو میں صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ سید احمد صحافت کی اعلیٰ قدروں کے ترجمان تھے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو بتایا کہ سچائی، صداقت روی اور سنجیدگی ایک صحافی کا اسوۂ زندگی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اظہار خیال کی آزادی پر بھی زور دیا۔ وہ صحافت کو سچائی اور رائے عامہ کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔'' ۶۵

خلیق احمد نظامی کی یہ بات کافی حد تک درست ہے سرسید نے گاہے بگاہے تہذیب الاخلاق میں اس کے مضامین کے تعلق سے مضمون شائع کیا اور قارئین سے بھی رائے طلب کی کہ وہ کس طرح کے مضامین اس میں پسند کرتے ہیں۔

> ''پس ہم ایسے دوستوں سے چاہتے ہیں کہ وہ ہم کو بتلا دیں کہ حال کا 'تہذیب الاخلاق' کس رنگ کا ہونا چاہیے اور کس قسم کے مضامین اس میں مندرج ہونے مناسب ہیں اور قوم کے لیے مفید اور ضروری ہیں جہاں تک ہماری سعی سے ممکن ہے ہم اس کی اصلاح پر کوشش کریں گے۔'' ۶۶

تہذیب الاخلاق کے مستقل مضمون نگاروں میں نواب محسن الملک اور مولوی مہدی علی نے کافی اچھے اچھے شہہ پارے تخلیق کئے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے مضامین عام فہم تو ہوتے ہی تھے انھیں درد واثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا تھا۔ کیونکہ قوم

کے ان ہمدردوں کے دل میں قوم کا حقیقی درد بھرا تھا اور یہ لوگ قوم کو ذلت کی زندگی سے نکال کر ترقی اور کامیابی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

''سید احمد خان کے عزائم کا پتہ تہذیب الاخلاق سے چلتا ہے۔ ان کا تعلیمی پروگرام بہت ہمہ گیر اور وسیع تھا۔ اس پرچہ نے اپنا کام کیا اور قوم کو نہ صرف خواب گراں سے بیدار کیا بلکہ ان کو ایک خاص انداز فکر بھی دیا۔ وہ قوم جو اوہام کے تار و پود میں الجھی ہوئی تھی، جو مغربی تعلیم کے نام سے چراغ پا ہوتی تھی اور نئے حالات کی روشنی میں اپنے معاملات پر غور کرنے کے لئے قطعاً تیار نہ تھی۔ اس میں ایک ذہنی انقلاب اسی پرچہ کے ذریعہ آیا۔'' ۶۷

تہذیب الاخلاق کے اثرات قوم کے علاوہ دوسرے اخبارات و جرائد نے بھی قبول کیے جس کے بارے میں سرسید احمد خاں نے بھی اپنی ایک تقریر میں ذکر کیا ہے۔

''تہذیب الاخلاق کا پرچہ ابتداء میں اس واسطے جاری کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کے دل جو مردہ ہو گئے ہیں ان میں کچھ تحریک لائی جائے۔ ہندوستان کی حالت ایک بند پانی کی سی ہوگئی تھی جس سے طرح طرح کے نقصان اور مضرت کا اندیشہ تھا۔ اس کے واسطے ایک چپو کی ضرورت تھی کہ وہ اس کو ہلا دے۔ اس نے اپنا کچھ کام کیا۔ اب تحریک پیدا ہوگئی ہے۔ ہندوستانیوں کی زبانوں اور قلموں سے قومی ترقی اور ہمدردی کے الفاظ نکلنے لگے ہیں۔ اخباروں میں قومی بھلائی اور قومی ترقی کے الفاظ بلکہ آرٹیکل نظر آنے لگے ہیں جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پرچہ نے اپنا کام پورا کیا۔'' ۶۸

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں آزادی رائے نظر آتی ہے۔ مضامین کو سلسلے وار بھی پیش کیا جاتا تھا تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی برقرار رہے۔ کبھی کبھی تو ان مضامین کی طوالت کی وجہ سے اطلاع اور خریداری وغیرہ کی اطلاعات بھی شائع نہیں ہوتی تھیں۔ ملاحظہ ہو یکم شعبان ۱۳۱۲ھ کا پرچہ جس میں 'ھوالموجود' مضمون سے ہی پرچہ شروع کیا گیا ہے۔ قارئین کو جوڑے رکھنے کے لیے صحافت کا اصول ہے جسے پیشہ ور صحافتی ضرور اپناتے ہیں کہ قارئیں کو پڑھنے والوں کو اخبار یا جریدے سے جوڑ دیا جائے اور اسی کے وہ مضمون نگاری کے مقابلے، انعامی مقابلے یا دوسرے اور کوئی شعر و شاعری کے مقابلے اپنے جریدے میں رکھتے ہیں اسی طرح سرسید نے بھی اپنے رسالے میں خط و کتابت کا سلسلہ رکھا تھا اور جو بھی مراسلے موصول ہوتے تھے ان کا مفصل جواب دیا جاتا تھا اور وہ شائع ہوتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

''ہمارے پاس بہت سے خطوط اور مضامین بے نام و نشان آتے ہیں۔ خطوط میں تو بعض سوالات ہوتے ہیں۔ اور کبھی مسائل شرعی پوچھے جاتے ہیں اور یہ درخواست ہوتی ہے کہ تہذیب الاخلاق میں ملے جوابات چھاپ دیے جاویں اور مضامین بھی جو آ گئے ہیں وہ ہماری اور ہمارے مدرستہ العلوم کی حمایت اور ہمارے مخالفین اور ہمارے ذاتی افعال سے الزامات مخالفین کی تردید میں ہیں اور یہ درخواست ہے کہ تہذیب الاخلاق میں چھاپ دیے جاویں۔ ان سب بزرگوں کا جنھوں نے اس قسم کے خطوط خواہ مضامین بھیجے ہیں ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں اور جو کہ بہ سبب نہ معلوم ہونے نام و نشان کے ہم ان کو جواب نہیں بھیج سکتے۔ اس لیے عدم تحریر جواب کا عذر کرتے ہیں باقی رہا ان کا مزاج ہونا تہذیب الاخلاق میں اس میں بھی ہم کو چند عذر ہیں ہمارا دستور نہیں ہے کہ کوئی بے نام مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپیں اور نیز کوئی ایسا مضمون جو ہمارے ذاتی افعال کی حمایت میں ہو ہم کو اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق میں چھاپنا پسند نہیں ہے۔'' ۶۹

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ قوم کی بھلائی کے علاوہ دوسری کوئی چیزیں تہذیب الاخلاق میں شائع نہیں ہوتی تھیں۔ ذاتی باتیں شائع کرنے کا بھی کوئی کالم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب الاخلاق میں کوئی مراسلے تہذیب الاخلاق کے خلاف اور سرسید کے خلاف شائع ہوتی رہیں ہیں۔ یہ سرسید کا ہی جگر تھا کہ اپنے ہی رسالے میں اپنے خلاف لکھی باتوں کو من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ یہ تھی ان کی صحافت اور آج کے اخبارات کا یہ حال ہے کہ اگر ایک لفظ بھی ان کے خلاف ہوا تو شائع نہیں ہوگا بلکہ اس مضمون نگار کا آئندہ کوئی مضمون شائع نہیں کیا جاتا۔ سرسید کی آزادی رائے نے دوسرے آگے آنے والے صحافیوں کو راستہ دکھایا کہ صحافت کی راہ پر چلنے کے لیے کیا کیا خصوصیات ضروری ہیں۔

> ''سرسید صحافت جو معیار قائم کیا تھا اس کو بیشتر اخبارات نے پیش نظر رکھا۔ تہذیب الاخلاق کی ایک نمایاں خصوصیت اس میں معیاری مضامین کی اشاعت ہے جس نے نہ صرف ذہنوں کو بدلا بلکہ ان کی تربیت بھی کی۔ روشن خیالی، علمی وقار اور روایت سے بغاوت کا سبق جس ہمہ گیر انداز سے سرسید اور ان کے رفقاء مضامین نے لوگوں کو پڑھایا اس کے نتیجے میں لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل گئے۔ شعر، ناول، انشائیے، افسانے، تمثیل، سوانح، تحقیق وتنقید اور صحافت سبھی متاثر ہوئے۔''۲۰

اگر یہ کہا جائے تو شاید صحیح ہوگا کہ سرسید کے مضامین کا بنیادی مقصد قوم کی بھلائی اور فلاح تھا نہ کہ اردو زبان وادب کی اصلاح تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بھی خیالات کو من وعن بیان کر دیا جاتا تھا۔ ایک صحافی کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ الفاظ اور تحریر کی خوبصورتی سے پہلے اپنے خیالات کی ترسیل چاہتا ہے۔ ایک صحافی کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ الفاظ اور تحریر کی خوبصورتی سے پہلے اپنے خیالات کی ترسیل چاہتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو تہذیب الاخلاق نے اردو صحافت نگاری میں ایماندارانہ صحافت کا معیار قائم کیا اور سرسید نے ایک سچے صحافی کا حق ادا کیا ہے۔

امداد صابری لکھتے ہیں۔

> ''تہذیب الاخلاق نے حقیقتاً علمی، مذہبی معلوماتی اور سیاسی مسائل سے لوگوں میں بڑی کایا پلٹ کی تھی اور سرسید نے اس اخبار کے ذریعہ اپنے خیالات سے علمی طبقے کو روشناس کرایا تھا اور تعلیم کی طرف توجہ دلائی تھی۔ تہذیب الاخلاق اپنے دور میں اپنا نظیر آپ تھا۔ اگر سرسید مذہبی معاملات میں نہیں الجھتے تو اس اخبار کی مقبولیت بے پناہ ہوتی اور مخالفت کا سیلاب نہ اٹھتا۔''۱۲

انجمن پنجاب لاہور نے تہذیب الاخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ''مضمون وبیان کے بلند معیار کی وجہ سے تہذیب الاخلاق قابل ستائش ہے یہ اخبار ہر حیثیت سے فرد افروز ہے۔''۲۲

تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا اور یہاں تک کہ قوم کو لکھنا پڑھنا سوچنا سمجھنا سکھایا۔ سرسید نے ایک عام ادیب کی طرح دل ودماغ کے لیے فرحت بخش تحریریں نہیں تخلیق کیں تفریح اور ذہنی سکون کے سامان نہیں مہیا کیے بلکہ ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے دل ودماغ اور فکر کے گوشے گوشے میں تبدیلی لادی۔ ان کے طرز تحریر اور تہذیب الاخلاق پر کافی انگلیاں اٹھیں اور اعتراضات کیے گئے یہاں تک کہ ان کی تحریر اور ان کے پرچے کو ادب سے باہر قرار دیا گیا لیکن دھیرے دھیرے مخالفت کے بادل چھٹتے گئے اور اردو ادب اور صحافت کا ایک نیا سورج طلوع ہوا جہاں ادب اور صحافت ایک دوسرے سے مشترک ہو گئے۔ یہ سرسید کی بطور صحافی اور بطور ادیب سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سرسید نے جہاں ادب کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھامی وہاں صحافت دونوں مقام پر اپنا نام نقش کروالیا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں۔

''تہذیب الاخلاق نے مسلمانانِ ہند کو قنوطیت کے جہنم سے نکال کر علوم حاصل کرنے، مذہب کو دلائل عقلی سے سمجھنے، سنجیدہ علمی کاموں میں زبان اردو کے استعمال کرنے اور اس کے ادب کو معیار اعلیٰ تک پہنچانے کا ماحول بنایا۔''۳؎

اسی بات کو ڈاکٹر محمد شاہد حسین لکھتے ہیں۔

''اس اخبار نے مسلمانوں کو فرسودہ روایات و خیالات اور بے جا رسم و رواج، اندھی تقلید ترک کرنے اور تعلیم شواہد و ہر قسم کے علوم و فنون سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔ سر سید احمد خاں نے اردو صحافت کو صداقت، بے خوفی اور بے غرضی کی اعلیٰ روایات سے اس وقت روشناس کرایا جب وہ عہد طفولیت میں تھی۔ انھوں نے صحت مند صحافت کی، کبھی کسی پر کیچڑ نہیں اچھالا اور نہ ہی بے جا تنقید کی۔ سر سید نے اخبار کو محض خبروں کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس سے معاشرے کی اصلاح کا کام بھی لیا۔''۴؎

سر سید کے تہذیب الاخلاق کی جہاں اخبارات مخالفت کر رہے تھے وہیں اردو گائیڈ کلکتہ، پنجابی اخبار، لاہور، پٹیالہ اخبار وغیرہ سر سید کی حمایت کر رہے تھے۔ سر سید نے یکم محرم ۱۲۹۰ھ کے شمارے میں ان اخبارات کا شکریہ ادا کیا ہے۔

''ہمارے ملک کے بہت سے نامی اخباروں نے ہمارے ساتھ صرف اپنی قومی خیرخواہی اور پٹریاٹزم کے جوش سے ہمدردی بھی کی ہے۔ پس ہم ان اخباروں کا اور ان کے ایڈیٹروں کا جس میں سے ہم کو پنجابی اخبار لاہور اور کلکتہ اردو گائیڈ اور پٹیالہ اخبار اور علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی اخبار اور اودھ اخبار کا نام لینا چاہیے۔''۵؎

سر سید نے یہاں دوسرے اخبارات کا شکریہ ادا کر کے یقیناً صحافت کی اعلی قدروں کا پاس رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو اپنے مخالف اخبارات کا ذکر بھی بڑے ہی اچھے انداز میں کرتے تھے اور انھیں پورا موقع دیتے تھے کہ وہ تہذیب الاخلاق لکھتے رہیں۔ سر سید کے مذہبی عقائد سے عبدالحلیم شرر کو بھی اختلاف تھا لیکن وہ اپنے رسالے 'دلگداز' کے مارچ ۱۹۱۱ء کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

''ایک مدت کی ناامیدی کے بعد سر سید مرحوم نے ہماری اجڑی ہوئی تاریک سنسان اور خاموش محفل میں علم کا ایک چراغ روشن کیا تھا جس کی شعاعیں مسلمانوں کی تدریجی بیداری کے ساتھ زیادہ روشن ہوتی جاتی تھیں۔ اگلے مذاق کڑوے تیل کے چراغ سے ترقی کر کے وہ لیمپ بنا۔ اس لیمپ کی روشنی میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ گیس کے درجے کو پہنچ گیا۔''۶؎

وکیل امرتسر مطبوعہ ۲۷/اپریل ۱۸۹۶ء کو لکھتا ہے۔

''چونکہ قبلہ سر سید کو اپنی قوم سے اعلیٰ درجہ کی خالص اور سچی ہمدردی ہے۔ اس لیے ہمیں اس بارے میں زیادہ تر شکایت انہی سے ہونی چاہیے۔ اس امر سے شاید ہی کوئی کافر نعمت انکار کر سکتا ہوگا کہ جو کچھ ہند کے مسلمانوں کے لیے حضور ممدوح کی ذات بابرکات سے ظہور میں آیا ہے وہ سلف میں تھوڑوں سے ہو سکا ہے اور آئندہ بھی بہت تھوڑے ویسا کر سکیں گے۔''۷؎

صحافت اور اخبارات کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے سیکولرزم اور اتحاد و اتفاق کی مضبوطی کے لیے عوام کو صحیح راستہ بتائیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تہذیب الاخلاق نے بھی عوام میں جمہوریت اور اتحاد و اتفاق پر زور دیا۔ صحافت کی عظمت اور نیک نامی انھیں باتوں پر منحصر کرتی ہے۔ صحافت کا مقصد تعمیری ہونا چاہیے نہ کہ تخریبی۔ صحافت تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب ایک واضح مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے اخبار یا رسالے کے ذریعہ خیالات کو عوام تک پہنچایا جائے۔ تبھی کوئی بھی

معاشرہ مثالی معاشرہ بنے گا اور سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ یہ سب کر کے ثابت کر دیا کہ صحافت کے ذریعہ اعلیٰ کام لیے جا سکتے ہیں اور ملک کی سماجی زندگی کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ سرسید کا یہ پرچہ محض صحافت نہ ہو کر، صرف صحیفہ نہ ہو کر 'تاریخی صحیفہ' ہے اور سرسید کی صحافت نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کو سنوارنے اور معاشرے کی اصلاح کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اسکے علاوہ زبان وادب کو بھی اس سے کافی فائدہ ہوا۔ سید احمد قادری لکھتے ہیں۔

''تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سرسید نے اردو صحافت کو بامعنی اور بامقصد بنانے کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور شاعری کے معیار اور وقار میں بھی اضافہ کیا۔ اس دور کا اردو ادب اور صحافت دونوں ہی 'تہذیب الاخلاق' کے صحت مند رویوں سے متاثر ہوا اور بلاشبہ اس نے ادب اور صحافت میں نئی روح پھونک دی۔ جس سے متاثر ہو کر شیخ عبدالقادر اپنے ماہنامہ 'مخزن' کے اپریل ۱۹۰۱ کے شمارے کے اداریے میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ اردو ادب میں سادگی پسندی کا جو نیا مذاق پیدا ہوا، وہ بہت کچھ 'تہذیب الاخلاق' کے نامور ایڈیٹر اور اس کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔'' ۸ے

سید احمد قادری کی یہ بات بالکل صحیح ہے اور بعد کے اخبارات نے تہذیب الاخلاق کی نثر اور اس کے انداز کو اپنایا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی اور بے شمار تصنیفات رقم کیں اور اگر سرسید نے یہ سب نہ بھی کیا ہوتا تب بھی سرسید کا مقام بحیثیت اردو صحافی کافی بلند ہوتا اور اردو صحافت کی تاریخ ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتی۔

اردو صحافت کی تاریخ میں تہذیب الاخلاق کو اس لیے بھی اہم مقام دیا جائے گا کہ پہلی بار خالص مقصدی صحافت کا آغاز اس پرچے سے ہوتا ہے۔ آج کے صحافی حضرات اس پیشے میں صرف اور صرف پیسے کے لیے آتے ہیں جب کہ آج کے حالات بھی ایسے ہی ہیں کہ سرسید کی کوششیں اور ان کی حکمت عملی یاد آتی ہے۔ آج بھی ملک کو ویسے ہی حالات درپیش ہیں اور پھر سے سرسید جیسے ایک صحافی کی ضرورت ہے جو صحافت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھا سکے۔ سرسید نے جس طرح سے قوم کی اصلاح کی اور ساتھ ہی ساتھ صحافت کے قوانین سے کبھی خلاف ورزی بھی نہیں کی۔ یہ یقیناً سرسید کی صحافت کا درخشاں باب ہے اور تہذیب الاخلاق ان کی صحافت کا چمکتا ہوا ستارہ جس کے مضمون آج بھی ہمارے دلوں کو گرما دیتے ہیں اور بے اختیار سرسید کی کوششیں یاد آ جاتی ہیں۔

☆ تہذیب الاخلاق کے مخالفین اور ان کے اخبارات

سرسید احمد خاں نے اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ معاشرے میں پھیلی گمراہیوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کام انھیں کافی مہنگا پڑا۔ سرسید کے خیال میں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ تعلیم کی کمی اور مذہبی عقائد کو غلط انداز میں سمجھنا تھا۔ اسی لیے انھوں نے تہذیب الاخلاق میں مذہبی مضامین شائع کیے اور ان مضامین میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھ ڈالیں جو عام مسلمانوں کے عقائد کے خلاف تھیں۔ عبادت کا صحیح معنی پیری مریدی، مسجد میں جوتا پہن کر نماز، اہل کتاب کے ساتھ تعلقات، قرآن کی تعلیمات وغیرہ کے سلسلے میں انھوں نے عقلی استدلال سے ثابت کرتے ہوئے مضامین شائع کیے۔ جب اس قسم کے مضامین شائع ہونے شروع ہوئے تو مخالفت کا ایک سیلاب امڈ پڑا لیکن مخالف کے اس طوفان سے سرسید اور ان کے ہم نوا مولوی چراغ علی اور سید مہدی علی گھبرائے نہیں بلکہ سینہ سپر ہو کر طوفان کا مقابلہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

تہذیب الاخلاق کے ان مضامین سے جہاں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو ناراضگی تھی وہیں کچھ ایسے لوگ بھی

تھے جوان مضامین کو پسند کررہے تھے۔ان لوگوں کی ہمت افزائی نے سرسید احمد کے جوش کو بڑھانے میں مدد کی۔مخالفت کی اس آندھی میں سرسید نے ایک چراغ اور روشن کردیا۔ پرچہ تہذیب الاخلاق میں سرسید نے ایک اشتہار شائع کیا کہ جب مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوم انگریزی تعلیم سے فائدہ اٹھارہی ہے تو مسلمان کیوں اس سے پیچھے ہیں۔اس کے اسباب دریافت کیے جائیں اور مسلمانوں کوانگریزی تعلیم اور جدید تعلیم کی جانب راغب کیا جائے۔اس کے لیے مسلمانوں کوخود ہی اس طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔اس بارے میں کمیٹی مسلمانوں کومضامین لکھنے کی دعوت دیتی ہے اوراچھے مضامین پرانعامات بھی دیے جائیں گے۔ملاحظہ ہو۔

ازصدر کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان

اس کمیٹی کو یہ مطلوب ہے کہ جہاں تک ممکن ہواس بات کے وجوہ واسباب کوکماینبغی دریافت کرے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں اور تحصیلی اور حلقہ بندی مکتبوں میں مسلمان طالب علم کس لیے نہایت کم پڑھتے ہیں اور نیز عموماً مسلمانوں میں تحصیل علوم قدیمہ کیوں گھٹ گئی ہے اور تحصیل علوم جدیدہ نے کیوں نہیں رواج پایا۔اس لیے ہرایک مسلمان شخص سے جوامور مذکورہ بالا پرتحریری رائے دینی چاہے کمیٹی کی یہ درخواست ہے کہ وہ ایک رسالہ مضمون مذکورہ بالا پر مطابق ہدایات اور شرائط مندرجہ ذیل کے لکھ کر سکریٹری کمیٹی کے پاس بھیج دے۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کمیٹی انعام مجوزہ ان مصنفوں کوعطافرماوےگی۔اس لیے اشتہار دیا جاتا ہے کہ جس مسلمان شخص کوایسارسالہ لکھنے کی خواہش ہولکھ کر بھیج دے۔‘‘۹ے

بعد میں اس کمیٹی کے جلسے میں سرسید نے ایک رپورٹ پیش کی جس کا نقطہ عروج یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیمی بے راہ روی کے لیے مسلمانوں کوخود ہی فکر کرنی ہوگی۔اس رپورٹ میں سرسید نے کالج کی طریقہ تعلیم بھی بیان کیا تھا۔رپورٹ کی ایک کاپی حکومت ہنداور تمام بڑے افسران کوبھی بھیجی گئی۔حکومت نے سرسید کی اس کوشش کوسراہتے ہوئے وعدہ کیا کہ اگر یہ کالج قائم ہوتا ہے تو حکومت پوری پوری مدد کرے گی۔اس سلسلے میں انگریز حکام نے کچھ رقم بطور چندہ بھی دی۔سرسید کے فرزند سید محمود نے لندن کے طریقہ تعلیم پر مرتب کردہ ایک رپورٹ بھی حکومت کوپیش کی اور بعد میں اس رپورٹ کوشائع کیا گیا جب یہ رپورٹ شائع ہوئی تو سرسید کے سب سے بڑے مخالف مولوی امدادالعلی جوکانپور کے ڈپٹی کلکٹر تھے علماء کرام کے سامنے سرسید کے عقائد پرسوال اٹھاتے ہوئے سرسید کے خلاف تحریک شروع کرنے کا اعلان کردیا۔مولوی امدادالعلی کا کہنا تھا کہ جس شخص کے عقائد خدااور رسول کی باتوں کے خلاف جاتے ہیں کیاایسا شخص اسلام کے دائرے میں ہے ایک دوسری بات امدادالعلی نے یہ کہی کہ جس کالج میں اس طرح کی تعلیم دی جائے گی جس سے عام مسلمان اور گمراہ ہوگا تو کیا ایسی جگہ چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

امدادالعلی کی اس تحریک سے مخالفت کا وہ بازار گرم ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کالج میں سرسید کے بت رکھے جائیں گے۔افواہیں اڑادی گئیں کہ سرسید کے عقائد درست نہیں ہیں۔اس لیے اس کالج کوقائم کروانے میں مدد کرنا بھی گناہ ہوگا۔اس طرح کی باتیں جب عام ہوئیں تو مولوی امدادالعلی نے علمائے کرام حرم شریف سے رجوع کیا اوران کے فتوؤں کے مطابق سید احمد کا فرقرار دے دیے گئے۔ان فتوؤں پر ساٹھ علمائے اسلام کے دستخط تھے۔اخبارات بھی سید احمد کے خلاف مضامین شائع کررہے تھے اور سید احمد کا خوب خوب مذاق اڑایا جارہا تھا۔

’’سید احمد کے یہ خیالات جب مسلمانوں کے قدامت پسند گروہ تک پہنچے تو ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔اخبار اودھ پنچ نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا اس کے ہر شمارے میں سید احمد کے خیالات پر

پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں۔'' ۸۰؎

تہذیب الاخلاق کے مضامین جہاں مسلمانوں کے مذہبی عقائد پر تنقید کرتے تھے وہیں اب تہذیب الاخلاق میں مدرستہ العلوم کی تعمیر کی باتیں بھی لکھی جانے لگیں اور لوگوں میں افواہیں اور سرسید کی طرف سے بے رخی اور بڑھتی جارہی تھی۔ مولوی امداد العلی سرسید کی مخالفت میں آگے آگے تھے اور انھوں نے کانپور سے جنوری ۱۸۷۱ء، نورالانوار اور نورالآفاق ۳۰ر اگست ۱۸۷۳ء نامی پرچے شروع کیے۔ ان پرچوں میں تہذیب الاخلاق کے خلاف خوب خوب لکھا جاتا تھا اور ان کے شروع کرنے کا مقصد ہی سرسید اور تہذیب الاخلاق کی مخالفت کرنا تھا۔ ان رسالوں نے تہذیب الاخلاق اور اس کے حامیوں کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں کو ملحد کافر، ملعون، دہریہ کہا جاتا تھا اور سرسید کا نام زندیق، شیطان اور نیچری رکھا گیا تھا۔ اس بارے میں عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

> ''سرسید کا تعلیمی منصوبہ بھی تہذیب الاخلاق کی مخالفت کی لپیٹ میں آنے سے نہ بچ سکا بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ تہذیب الاخلاق کے تیز و تند مضامین ہی نے مدرستہ العلوم کی مخالفت کی راہیں ہموار کیں۔ مشتاق حسین جو آگے چل کر وقار الملک بنے۔ سرسید کے نام ان کا ایک خط مورخہ ۲۰ راگست ۱۸۷۲ء علی گڑھ آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ یہ خط اس پروپیگنڈے کی وسعت و گیرائی کی نشاندہی کرتا ہے جو تہذیب الاخلاق کے مضامین کی آڑ لے کر مدرستہ العلوم کے خلاف کیا جارہا تھا۔ مشتاق حسین نے سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ جب تک مدرسے کے لیے پورہ چندہ نہ ہو جاوے تب تک تہذیب الاخلاق کے لیے بے لگام مضمونوں کی فی الجملہ روک تھام ضروری ہے۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں لیکن میں دیکھتا ہوں اور کوئی مضمون نہیں ملتا۔'' ۸۱؎

لوگوں کی مخالفت بڑھتی جارہی تھی اور لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ جس پرچے کہ مضمون نگاروں پر اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ کر دیا گیا ہے وہ ان کے مدرسے میں کیسی تعلیم دی جائے گی۔ سرسید احمد خاں مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے میں لگے تھے۔ لوگوں کے پاس جا کر وہ چندہ مانگ رہے تھے۔ لوگ انھیں دیکھنے کو چلے آتے تھے کہ دیکھیں جس پر کفر کا فتویٰ لگا ہے وہ کیسا انسان ہے لیکن جب دیکھتے اور باتیں کرتے تو ان کے خیالات تبدیل ہو جاتے۔ اس لیے لوگوں نے ایک دوسرے کو کہنا شروع کر دیا کہ اس کی باتیں ہی مت سنو اور سنو گے تو اپنے خیالات پر قائم نہیں رہ سکو گے لیکن سرسید احمد خاں نے ہار نہیں مانی اور اپنی کوشش میں لگے رہے۔

دوسری جانب سرسید نے صحافت کے میدان کو جنگ کے میدان میں تبدیل کر دیا تھا اور اردو اخبارات سرسید کے خلاف آواز پر آواز اٹھاتے جارہے تھے۔ تیرہویں صدی ۱۸۸۰ آگرہ، لوح محفوظ مرادآباد، تائیدالاسلام، ۱۸۸۱، مرادآباد، اکسیر اعظم ۱۸۸۶، مرادآباد وغیرہ نئے اخبارات جاری ہوئے۔ ان کے علاوہ امداد الاحتساب ۱۸۶۶ء، مظاہر الحق، تنقیح البیان، تریاق، تصفیۃ العقائد، برکات الدعا، شہاب ثاقب، حدیقۃ المذہب، اودھ پنچ وغیرہ اخبارات و رسائل پہلے سے ہی سرسید کے خلاف زہر افشانی کررہے تھے۔ اخبار تائیدالاسلام کے مدیر کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں۔

> ''تائیدالاسلام کے ایڈیٹر مولوی قاضی احتشام الدین تھے جن اغراض و مقاصد کے ماتحت یہ اخبار جاری ہوا وہ یہ تھے۔ سید احمد خان بہادر کا جھوٹی سرسید احمد خاں صاحب بہادر کی جہالت، سید احمد خاں صاحب بہادر کا مذہب، سید احمد خاں صاحب بہادر کی رائے تذبذب۔'' ۸۲؎

اس طرح کی باتوں کا بھی سرسید نے برا نہیں مانا اور اپنے کام میں لگے رہے اور یہاں تک کہ اپنے اخبار میں اپنے مخالف اخباروں کا تذکرہ کیا ہے۔

> ''ناصحان شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ آخر کار کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا، دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں

سے کفر کے فتوؤں پر مہریں چھپواہی، منگائیں اور ہمارے کفر پر ہمارے ناصح شفیق جناب مولوی حاجی سید امدادالعلی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیااورامدادالآفاق اس کا نام رکھا۔۔۔اخباروں میں نورالانوارتو اپنا نور عالم میں برسا ہی رہا تھا مگر اس سے ایک اور پرچہ ان کے گھر کا اجالا مسمی بہ نورالآفاق الدفع ظلمت اہل النفاق پیدا ہوا ہے جونہایت ہی دلچسپ ہے اور ہمارے اس پرچے تہذیب الاخلاق کے جواب میں نکلا ہے۔ اس کے مضامین تو جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں مگر بعضے لوگ ان مضامین کو سے پالک بتاتے ہیں۔''۸۳؎

سرسید کی مخالفت کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی بھی نہیں بچ سکے اوران کے بارے میں لکھا گیا کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ملاحظہ ہو۔

''جہاں اخبارات میں نیچریوں کے خلاف طوفان اٹھاوہاں مولانا حالی کے ان خیالات کے خلاف بھی لکھا جانا شروع ہوا۔جس میں تیرہویں صدی اور اودھ پنچ نے کافی حصہ لیا اور اودھ پنچ بہت پیش پیش رہا۔ جہاں اس کو مولانا حالی کے پیر نیچر سرسید کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر رنج تھا وہاں ان پر ان کے دو اعتراض تھے۔پہلا اعتراض یہ تھا کہ ان کی شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطری شاعری کی لطافت ورنگینی سے خالی ہے۔اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں۔ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا تھا۔جس کا لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شاعروں کی توہین ہو۔(نمونہ مضامین چکبست)۸۴؎

ایک طرف کچھ اخبارات تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کرر ہے تھے تو دوسری طرف کچھ اخبار ایسے بھی تھے جو سرسید کا ساتھ دے رہے تھے۔سرسید نے اودھ اخبار کی تعریف کی ہے اور اس کے روزانہ شائع ہونے کی دعاء بھی دی ہے۔

''اودھ اخبار پہلے سے بھی نہایت باوقعت اخبار تھا اور اب تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ہم کو امید ہے کہ ہمارے ہم عصر وقائع نگار بھی اودھ اخبار کی تقلید کریں گے اور منشی نول کشور سلمہ تعالی کی عالی ہمتی سے یہ امید ہے کہ ان کا اخبار مثل بڑے بڑے باوقعت انگریزی اخبارات کے روزانہ جاری ہوا کرے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔''۸۵؎

سرسید احمد خاں کے عقائد پر اودھ اخبار میں بھی مضامین شائع ہوئے تھے۔غلام محمد خاں تپش کی خوب بنتی تھی اور دونوں میں خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔سوانح منشی نول کشور میں سید امیر حسن نورانی لکھتے ہیں۔

''منشی نول کشور سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے حامی تھے۔سیاسی معاملات میں بھی دونوں بہت عرصے تک ہم نوا ہے۔اودھ اخبار میں سرسید کی حمایت میں مضامین اور مراسلے شائع ہوتے تھے۔انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد دونوں کے سیاسی نظریات میں اختلاف رونما ہوا لیکن دونوں کے دوستانہ تعلقات میں کوئی کمی نہیں آئی۔منشی نول کشوران کی بہت عزت کرتے تھے۔ان کی مخالفت میں جو مضامین ومراسلات اودھ اخبار میں اشاعت کے لیے آتے تھے ان کو شائع کرنے سے پہلے گریز کرتے تھے اور جن کو شائع کرنا ضروری ہوتا تھا اس کے ساتھ اودھ اخبار کے ایڈیٹر اس کی مخالفت یا تردید میں بھی کوئی مختصر تحریر شامل کردیتے تھے۔''۸۶؎

تہذیب الاخلاق یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ کے شمارے میں اودھ اخبار کے مدیر غلام محمد خاں تپش کا ایک خط بھی اسی

بارے میں شائع ہوا تھا۔اس میں غلام محمد خاں تپش لکھتے ہیں۔

''میں نہایت افسوس اور عذر کرتا ہوں کہ بعض ہی نہیں بلکہ اکثر حضرات آپ کے بالکل خلاف رائیں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ پس وہ اول تو بہت کم چھاپی جاتی ہیں اور جو چھاپی جاتی ہیں ان کی تردید میں کبھی نہ کبھی رائے دے دی جاتی ہے اور بہت سے مضامین واپس جاتے ہیں۔ اکثر ردی کے لیے جاتے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ امور کا لحاظ رہے گا۔ رقیم نیاز۔ غلام محمد ایڈیٹر۔ ۸۷

تہذیب الاخلاق کی صحافت آزادی رائے کی جو مثال پیش کرتی ہے وہ اس وقت دوسرے اخبارات میں نہیں تھی۔ تہذیب الاخلاق میں ۱۲۹۳ھ میں سرسید نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس میں مختلف اخبارات کے اعتراضات وسوالات شائع ہوتے تھے ساتھ ہی تہذیب الاخلاق کے جوابات بھی شائع کیے جاتے تھے۔ محمد اسمعیل پانی پتی لکھتے ہیں۔

''ہندوستان کے مختلف اخبارات جو اعتراضات سرسید پر کرتے یا ان کے متعلق کسی رائے یا خیال کا اظہار کرتے یا کوئی شخص سرسید کو خط لکھ کر کسی بات کی وضاحت چاہنا اور ان سے مسئلہ زیر بحث کے متعلق ان کی رائے پوچھنا تو سید صاحب ان کے اعتراض یا رائے یا خیال کو بجنسہ نقل کرنے کا بعد اس کا جواب دیتے یا ان کی تحریرات پر اپنی رائے یا خیال کا اظہار کرتے۔'' ۸۸

اس طرح کا مضمون تہذیب الاخلاق کے یکم شوال ۱۳۱۴ھ میں موجود ہے جس میں نجم الاخبار کے مدیر نے تہذیب الاخلاق کی مخالفت میں اداریہ تحریر کیا تھا اور تہذیب الاخلاق میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''ہمارے دوست ایڈیٹر نجم الاخبار اٹاوہ نے ایک ایڈیٹوریل آرٹیکل تہذیب الاخلاق اور اس کے معاونوں کی نسبت لکھا ہے گو ہم کو تعجب ہوا کہ ایڈیٹوریل، کفر کا لفظ کیونکر ان کی مقدس زبان پر آیا مگر ہم کو نہایت خوشی سے اس کو بعینہ نقل کرتے ہیں۔ بھئی تہذیب الاخبار کے معاونوں، خریداروں، پڑھنے والوں، چھونے والوں، دیکھنے والوں، دور سے دیکھنے والوں خواب میں دیکھنے والوں، خیال کرنے والوں ہوشیار رہو ایسا نہ ہو کہ خسر الدنیا والآخرۃ ہو جاؤ۔'' ۸۹

اسی طرح تہذیب الاخلاق میں نور الآفاق کے بند ہونے پر بھی مضمون شائع ہوا تھا۔ اسی طرح مختلف اخبارات کا تہذیب الاخلاق کا ساتھ دینے پر شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کے خلاف جو مضامین یا مراسلے دوسرے اخبارات میں شائع ہوتے تھے کبھی ان میں سرسید کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا جاتا تھا تو کبھی بہت ہی خراب زبان استعمال ہوتی تھی۔ آگرہ اخبار نے تہذیب الاخلاق کی ان اخبار میں خبر لی ہے۔

''آگرہ اخبار کو قدیم سے جو دلچسپی آنریبل سرسید احمد خاں صاحب بہادر کے خیالات کے ساتھ ہے اس کے سب سے بڑے قدر شناس سرسید ہیں۔ خدا ان کو ہماری سننے کے لیے بہت دنوں سلامت رکھے۔ اب کی مرتبہ جو تہذیب الاخلاق نکل رہا ہے اس کے خیالات میں وہ جدت نہیں جو پہلے تھی اور نہ مقالات میں وہ شوخیاں ہیں بعض تو سکھٹی ہیں جو سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ یا تہذیب الاخلاق میں بھرتی ہو گئے ہیں۔ ان کو تو دعویٰ اور دلیل کی بھی خبر نہیں۔ پس ان کے مناظرات میں دلچسپی ہو تو کیا خاک۔'' ۹۰

تہذیب الاخلاق اور اس کے تئیں اخبارات کے رویے کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر درست تھے۔ جیسا کہ امداد صابری لکھتے ہیں۔

''جو شخص بھی تہذیب الاخلاق اور اس کے مخالف اخبارات کا مطالعہ کرے گا تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ نیک نیت اور مخلص تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ طریقہ تعلیم اور

بعض دینی مسئلے اختلاف کے موجود تھے۔''۹۱

امداد صابری کی یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ مسلمانوں میں اس وقت یہ عام خیال پایا جاتا تھا کہ دینی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے اور دنیاوی تعلیم حاصل کر کے ہم کچھ خاص نہیں کر سکتے کیونکہ دنیاوی تعلیم کے حاصل کرنے میں ہمیں کچھ ایسی باتیں پڑھنی پڑیں گی جو ہمارے مذہب کے خلاف ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ سرسید نے جو نظریہ تعلیم لوگوں کے سامنے لایا وہ صحیح تھا لیکن سرسید دنیاوی تعلیم حاصل کرنے اور مسلمانوں کی ترقی کروانے کے لیے انتہا کی حد پر پہنچ جاتے ہیں اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اور مذہب کی کچھ باتیں دل سے یقین کرنے پر منحصر کرتی ہیں۔ ہمارا سچا عقیدہ اور یقین ہی ہمارے دعوے کو مضبوط ثابت کرتا ہے لیکن جس طرح کے خیالات سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ عام کرنے چاہے وہ عام مسلمانوں کو برانگیختہ کرنے میں مددگار ثابت ہوئے کیونکہ مذہب کے کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے ایمان اور عقیدہ ہی سب سے بڑی بات ہے اور انھیں ہم فطرت یا نیچر کے ترازو میں نہیں تول سکتے۔ جب کہ سرسید نے یہی کرنے کی کوشش کی اور ایسا کرنے میں کہیں وہ کامیاب نظر آتے ہیں تو کہیں وہ ناکامیاب۔ مخالفین کے تئیں ان کا رویہ اعتدال پسندانہ ہے جو انھیں ممتاز بناتا ہے جب کہ مخالف اخبارات ان کے خلاف انتہائی حد تک پہنچ گئے تھے اور سرسید کو بڑے سے بڑے خطابات سے نواز رہے تھے لیکن سرسید نے بڑے ہی صبر اور ثابت قدمی سے اپنی مخالفین کا جواب دیا کبھی انھوں نے مزاحیہ لہجہ اختیار کیا تو کبھی سنجیدگی سے جواب دینے پر اکتفا کیا۔

تہذیب الاخلاق کا یہ رویہ تہذیب الاخلاق کو ہم عصر اردو صحافت میں سب سے اونچا درجہ عطا کرتا ہے۔ اپنی تعریف پر تو سبھی خوش ہوتے ہیں لیکن جب تنقید کی جاتی ہے اور وہ بھی ایسی تنقید جس میں زہر بجھے نشتر شامل ہوں تو سنجیدہ سے سنجیدہ اخبار بھی جواب دینے میں صحافت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیئے ہیں لیکن تہذیب الاخلاق کے جوابات اور مخالفین کے لیے لکھے گئے مضامین صحافت کی درس گاہ کا ایک اہم سبق ہیں کہ صحافت ایسی ہونی چاہیے۔ اگر جواب دینا بھی مقصود ہو تو الفاظ اور جملے کی ساخت ایسی ہو جو پڑھ کر لگے کہ یہ مخالفت نہیں ہے بلکہ ہمیں سمجھایا جا رہا ہے اور ہماری اصلاح کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس لحاظ سے تہذیب الاخلاق نے دوسرے اخبارات کی مخالفت کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور جہاں ضرورت پڑی ان کا جواب بھی دیا۔ مولانا امداد صابری لکھتے ہیں۔

> ''سرسید اور ان کے مخالفوں میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ مخالفین سرسید میں زیادہ غلو ہے اور سرسید کے یہاں اعتدال ہے۔ ذاتیات کو دونوں نے کسی نہ کسی طریقے سے مطعون کیا ہے۔ بخشا کسی نے کسی کو نہیں ہے۔''۹۲

امداد صابری کی یہ بات بالکل درست ہے۔ سرسید نے جوابات دینے میں کبھی اپنی عقل اور شرافت کو جانے نہیں دیا اور صحافت کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے جوابات دیے۔ تہذیب الاخلاق کا سب سے بڑا مخالف نورالآفاق تھا جب یہ اخبار بند ہو رہا تھا تو اس نے تہذیب الاخلاق کے متعلق بڑے ہی اچھے انداز میں لکھا۔

> ''دربار دہلی میں جناب سی ایس آئی ای سید احمد خاں بہادر نے سید امداد العلی صاحب ڈپٹی کلکٹر مراد آباد سے بہ صدق دل اقرار فرمایا کہ اب ہم کبھی کوئی مباحثہ تہذیب الاخلاق میں نہ چھاپیں گے۔ پس ہم بھی اخبار نورالآفاق بہ جواب تہذیب الاخلاق کو موقوف کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ احیاناً اخبار تہذیب الاخلاق یا کوئی ان کے حوارین میں سے راہ قدیم میں قدم دھریں گے تو پھر ہمیں میدان ہمیں چوگان ہم بھی انشاء اللہ یہ اخبار جاری کریں گے۔''۹۳

اس کے جواب میں سرسید نے بھی تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھا کہ مولوی امداد العلی اگر مدرستہ العلوم کا ساتھ دیں

تو میں بھی تہذیب الاخلاق کو بند کر دوں گا۔

> اگر مولوی امداد العلی مدرستہ العلوم کی تائید میں دل سے شریک ہوں ۔ میں آج ہی تہذیب الاخلاق کو بند کر دوں گا کیونکہ میری رائے میں جناب امداد العلی خاں بہادر سی ، ایس ، آئی کا دل سے مدرستہ العلوم کی تائید کرنا بہ نسبت جاری رہنے تہذیب الاخلاق کے قوم کے لیے زیادہ مفید ہے۔'' ۹۴

غرض یہ کہ تہذیب الاخلاق کا جس پہلو سے بھی مطالعہ کیا جائے یہ اخبار بے مثل ہی ثابت ہوگا۔ آپ کے مضامین اردو صحافت میں اس کا کردار یا مخالفین کے تئیں اس کا رویہ یہ سبھی چیزیں تہذیب الاخلاق کو اردو صحافت میں ایک اہم مقام پر پہنچاتی ہیں۔ تہذیب الاخلاق نے اپنے مخالفین کے غصے کو مردانہ وار مقابلے کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ صحافت کا میدان کوئی اکھاڑہ نہیں ہے جہاں کسی کی ہار اور کسی کی جیت ہوتی ہے بلکہ یہ ایسا میدان ہے جہاں ہار اور جیت کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ اس ہار یا جیت کا اثر معاشرے اور سماج پر کتنا پڑا یہ سب سے اہم بات ہے۔ سر سید کی مخالفت کرنے سے جہاں کچھ بدگمان ہو رہے تھے تو کچھ بدگمان ایسے بھی تھے جو سر سید کی ثابت قدمی دیکھ کر سر سید کے ہم قدم ہو گئے ۔ یہ سر سید کی جیت تھی اور تہذیب الاخلاق کی جیت تھی۔ روز نامہ اعتماد حیدر آباد ۲۰ ردسمبر ۲۰۰۵ء کے اپنے شمارے میں لکھتا ہے۔

> اردو صحافت کے دوسرے دور کا آغاز سر سید احمد خاں نے کیا۔ سر سید احمد ، مفکر عالم ، مصلح اور رہنما تھے اور مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی بقاء ان کا مقصد نظر تھا۔ خالدہ ادیب خانم نے Inside India میں لکھا ہے کہ سر سید کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا پتھر ہندوستانی کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہے۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ ان کی سمت ہمیشہ وہ نہ رہی ہو جو سر سید پسند کرتے تھے۔'' ۹۵

قصہ مختصر یہ کہ تہذیب الاخلاق کے مضامین سے جہاں مخالفت کا طوفان امڈ پڑا۔ اس کے باوجود سر سید نے اپنے اصلاحی مقصد سے کبھی منہ نہیں موڑا اور مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور یہ مخالفت کہیں نہ کہیں سے ان کے لیے مفید ہی ثابت ہوئی کیونکہ کئی ایسے معاملات جو عام مسلمان پہلے سے نہیں جانتے تھے وہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ان کے سامنے آئے اور وہ اپنے طور پر فیصلہ لے سکتے تھے کہ دونوں مخالفین میں سچائی پر کون ہے۔ تہذیب الاخلاق میں مذہبی معاملات پر جو بھی لکھا گیا وہ ثبوت پر مبنی ہوتا تھا اور تفسیرات اور حدیث کی کتابوں کا حوالہ ہوتا تھا۔ اس لیے عام انسان کے سامنے اسلامی عقائد اور کئی ایسے مذہبی مسائل پر مفصل مضامین آئے جن پر پہلے کسی کی پہنچ نہیں تھی۔ اس طرح تہذیب الاخلاق اپنے مخالف اخبارات کے سامنے بھی عمدہ اور ثابت قدم صحافت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے تہذیب الاخلاق کو ایک معیاری پرچے کی فہرست میں سب سے پہلا مقام دیا جا سکتا ہے۔

حواشی

۱۔امداد صابری، روح صحافت۔مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی۔۶۔۱۹۶۸ء ص۔۵۱
۲۔مضمون مسلم صحافت ۱۸۵۷ء کے بعد اخبار روز نامہ اعتماد حیدر آباد۔۲۰ دسمبر ۲۰۰۵۔ص
۳۔جے نٹراجن۔بھارتیہ پتر کاریتا کا اتہاس۔پبلیکیشنز ڈویژن نئی دہلی۔حکومت ہند۔۲۰۰۲ء۔ص ۲۷
۴۔ڈاکٹر تاراچند۔مضمون مسلم سیاسی فکر کے رجحانات ۱۹۰۵۔۱۸۵۷، روز نامہ اعتماد حیدر آباد۔۲۰ دسمبر ۲۰۰۵۔ص۔
۵۔سرراس مسعود۔خطوط سرسید، نظامی پریس بدایوں۔یوپی ۱۹۲۴ء۔ص ۶
۶۔نسرین طفیل۔مضمون مقاصد اجرائے تہذیب الاخلاق اور اس کے اثرات ۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جنوری ۱۹۹۶۔ص ۶۱
۷۔سید احمد خاں۔سفر نامہ مسافران لندن۔مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، ۱۹۶۱ء۔ص ۲۶۳
۸۔تہذیب الاخلاق یکم شوال ۱۲۸۷ھ پہلا شمارہ
۹۔ایضاً۔یکم محرالحرام ۱۲۹۰ھ
۱۰۔ایضاً۔یکم شوال ۱۲۸۷ھ
۱۱۔ایضاً۔یکم رجب ۱۲۹۰ھ
۱۲۔ایضاً۔یکم رجب ۱۳۱۲ھ
۱۳۔طاہر مسعود۔مضمون بابائے اردو کی نو دریافت تحریر۔تہذیب الاخلاق کے فرائض ماہنامہ فکر و تحقیق۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی۔جولائی ۲۰۰۵۔ص۔۶۷
۱۴۔تہذیب الاخلاق یکم رمضان ۱۲۹۳ھ
۱۵۔ایضاً۔۱۵ شوال ۱۲۹۶ھ
۱۶۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ص۔۱۶۶
۱۷۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں۔مجلس ترقی ادب لاہور۔۱۹۶۳ء۔ص۔۲۲۸
۱۸۔مولانا الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی۔۱۹۷۹ء۔ص۔۱۶۶
۱۹۔سید عبداللہ۔میر امن سے عبدالحق تک۔ناز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ص ۱۵۲
۲۰۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں مجلس ترقی ادب لاہور۔۱۹۶۳ء۔ص ۲۲۸
۲۱۔عبداللہ خاں خویشگی۔مقالات سرسید۔نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ۔۱۹۵۲ء۔ص۔۱۶
۲۲۔ڈاکٹر نفیس بانو۔تہذیب الاخلاق۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، آرٹ ایکسپریس وارانسی۔۲۰۰۴ء۔ص ۱۰۲
۲۳۔تہذیب الاخلاق۔یکم ربیع الاول ۱۲۹۰ھ۔ص ۳۸
۲۴۔ڈاکٹر نفیس بانو۔تہذیب الاخلاق۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، آرٹ ایکسپریس وارانسی۔۲۰۰۴ء۔ص ۱۰۲
۲۵۔تہذیب الاخلاق۔۱۵ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ
۲۶۔امداد صابری۔تاریخ صحافت اردو جلد دوم۔جدید پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی۔۶۔۱۹۶۳۔ص۔۳۷۵

۲۷۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان و ہند میں۔مجلس ترقی ادب لاہور۔۱۹۶۳ء۔ص۔۲۲۹

۲۸۔عبداللہ خاں خویشگی۔مقالات سرسید۔نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ۔۱۹۵۲ء۔ص۔۱۴

۲۹۔ڈاکٹر نفیس بانو۔تہذیب الاخلاق۔تحقیقی وتنقیدی مطالعہ آرٹ ایکسپریس وارانسی۔۲۰۰۴ء۔ص ۱۰۷

۳۰۔عتیق صدیقی سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ،جامعہ نگر نئی دہلی۔۱۹۷۷ء۔ص ۱۵۲

۳۱۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال ۱۳۱۱ھ

۳۲۔ایضاً۔یکم شوال ۱۳۱۱ھ

۳۳۔ایضاً۔یکم ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ

۳۴۔تہذیب الاخلاق۔۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ

۳۵۔تہذیب الاخلاق۔یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ

۳۶۔ایضاً۔یکم شوال ۱۲۹۳ھ

۳۷۔ڈاکٹر مشتاق احمد۔سرسید کی نثری خدمات۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی۔۶۔۲۰۰۵ء۔ص۔۹۹

۳۸۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال ۱۲۸۷ھ

۳۹۔سید احتشام حسین۔مضمون علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو۔علی گڑھ میگزین،علی گڑھ نمبر۔مرتبہ نسیم قریشی۔۵۴۔۱۹۵۳ ۔ص۔۳۰

۴۰۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال ۱۲۹۶ھ ص۔۱۳۲

۴۱۔سید احتشام حسین۔مضمون،علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو۔علی گڑھ میگزین۔علی گڑھ نمبر مرتبہ نسیم قریشی۔۵۴۔۱۹۵۳۔ ص۔۳۱

۴۲۔رشید احمد صدیقی۔مضمون علی گڑھ ماضی وحال۔فکر ونظر۔سہ ماہی۔علی گڑھ۔۱۹۶۲ء ص۔۱۳۰

۴۳۔ڈاکٹر سید عبداللہ۔سرسید کا اثر ادبیات اردو پر۔علی گڑھ میگزین علی گڑھ نمبر مرتبہ نسیم قریشی۔۵۴۔۱۹۵۳ء۔ص۔

۴۴۔تہذیب الاخلاق۔۱۵ شوال ۱۲۸۷ھ

۴۵۔پروفیسر ابوالکلام قاسمی مضمون سرسید کا تہذیبی شعور۔ماہنامہ تہذیب الاخلاق۔مارچ اپریل ۱۹۹۸۔ص۔۲۰

۴۶۔تہذیب الاخلاق۔۱۰ صفر ۱۲۹۰ھ

۴۷۔ایضاً۔۱۵ جمادی الثانی۔۱۲۸۸ھ

۴۸۔ایضاً۔۱۵ ذی الحجہ۔۱۲۸۷ھ

۴۹۔ایضاً۔یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ

۵۰۔ایضاً۔یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ

۵۱۔ایضاً۔یکم جمادی الثانی ۱۲۸۸ھ

۵۲۔ایضاً۔یکم صفر ۱۳۱۱ھ

۵۳۔ایضاً۔یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ

۵۴۔ایضاً۔یکم صفر ۱۳۱۲ھ

۵۵۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال ۱۳۱۱ھ

۵۶۔ایضاً۔یکم ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ

۵۷۔ایضاً۔یکم ربیع الثانی ۔۱۳۱۲ھ
۵۸۔مولوی عبدالحق ۔مطالعہ سرسید احمد خان ۔ایجوکیشنل بک ہاؤس ،علی گڑھ ۔۲۰۰۱۔ص۔ص۔۸۵۔۸۴
۵۹۔ پروفیسر سیدہ جعفر۔مضمون سرسید اپنے افکار کے آئینے میں ۔ماہنامہ ایوان اردو دہلی ۔جنوری ۲۰۰۳۔ص۔۱۵
۶۰۔سید اقبال قادری ۔رہبر اخبار نویسی ۔ترقی اردو بیورو،نئی دہلی ۔۶۔۲۰۰۰ء۔ص۔۲۷۳
۶۱۔عابد صدیقی ۔ادب اور صحافت ۔نیرنگ اکیڈمی ۔حیدر آباد ۔۱۹۷۴ء۔ص۔۷۵
۶۲۔تہذیب الاخلاق ۔یکم شوال ۱۲۸۷ھ
۶۳۔ایضاً۔یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ
۶۴۔ایضاً۔یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ
۶۵۔خلیق احمد نظامی ۔سید احمد خان ۔پبلیکیشنز ڈویژن ،پٹیالہ ہاؤس ۔نئی دہلی ۔جون ۱۹۷۱ء۔ص۔۹۷
۶۶۔تہذیب الاخلاق ۔یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ
۶۷۔خلیق احمد نظامی ۔سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے ۔انجمن ترقی اردو ہند ۔نئی دہلی ۔۱۹۹۳ء۔ص۔۹۲
۶۸۔لکچروں کا مجموعہ۔ مرتبہ منشی محمد سراج الدین ۔اسلامیہ پریس لاہور ۔ص۔۲۴۱
۶۹۔تہذیب الاخلاق ۔یکم رجب ۱۲۹۰ھ
۷۰۔منظر اعظمی ۔اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ ۔اتر پردیش اردو اکادمی ،لکھنؤ ۱۹۹۶ء۔ص۔۲۴۰
۷۱۔امداد صابری ۔روح صحافت ۔مکتبہ شاہراہ ۔اردو بازار ۔دہلی ۔۶۔۱۹۶۸ء۔ص ۵۱
۷۲۔ایضاً۔ص۔۵۲
۷۳۔ڈاکٹر مشتاق احمد ۔سرسید کی نثری خدمات ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔دہلی ۔ ۶ ۔ ۲۰۰۵ء ص۔۹۸
۷۴۔پروفیسر محمد شاہد حسین ۔ابلاغیات ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔دہلی ۔۶۔۲۰۰۳ء ص۔۸۹
۷۵۔تہذیب الاخلاق ۔یکم محرم الحرام ۔۱۲۹۰ھ
۷۶۔مولانا امداد صابری ۔تاریخ صحافت اردو ۔جلد سوم ۔جدید پرنٹنگ پریس ۔جامع مسجد دہلی ۔۱۹۶۳ء ص۔۴۶۰
۷۷۔وکیل امرتسر ۔۱۲۷اپریل ۱۸۹۶ء۔ص۔۳
۷۸۔سید احمد قادری ۔مضمون سرسید کی صحافت ۔ماہنامہ تہذیب الاخلاق ،علی گڑھ ۔اپریل ۱۹۹۶ء ص۔۵۱
۷۹۔تہذیب الاخلاق ۔۱۵شوال ۱۲۸۷ھ
۸۰۔خلیق احمد نظامی ۔سید احمد خان ۔پبلیکیشنز ڈویژن ،پٹیالہ ہاؤس ۔نئی دہلی ۔جون ۱۹۷۱ء۔ص۔۹۷
۸۱۔عتیق صدیقی ۔سرسید احمد خاں سیاسی مطالعہ ۔مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۔جامعہ نگر ،نئی دہلی ۔۱۹۷۷ء ص۔۱۴۶
۸۲۔امداد صابری ۔روح صحافت ۔مکتبہ شاہراہ ،اردو بازار دہلی ۔۶۔۱۹۶۸ء۔ص۔۹۵
۸۳۔تہذیب الاخلاق ۔یکم محرم الحرام ۱۲۹۱ھ
۸۴۔امداد صابری ۔تاریخ صحافت اردو جلد سوم ۔جدید پرنٹنگ پریس ۔جامع مسجد ۔دہلی ۔۶۔۱۹۶۳ء ص۔۱۰۸
۸۵۔تہذیب الاخلاق ۔یکم جمادی الثانی ۔۱۲۸۸ھ
۸۶۔سید امیر حسن نورانی ۔سوانح منشی نول کشور ۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۔پٹنہ ۔۱۹۹۵ء۔ص۔۱۹۵
۸۷۔تہذیب الاخلاق ۔یکم جمادی الثانی ۔۱۲۸۸ھ
۸۸۔محمد اسماعیل پانی پتی ۔مقالات سرسید ۔حصہ دہم ۔مجلس ترقی ادب لاہور ۔۱۹۶۲ء۔ص۔۳۵۷

۸۹۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال ۱۳۱۱ھ

۹۰۔آگرہ اخبار۔ضمیمہ زمانہ مضمون تہذیب الاخلاق اور ہم۔۲۱ نومبر ۱۸۹۶ء

۹۱۔امداد صابری۔تاریخ صحافت اردو۔حصہ دوئم۔جدید پرنٹنگ پریس۔جامع مسجد۔دہلی۔۶۔ص۔۳۶۲

۹۲۔ایضاً۔ص۔۳۸۵

۹۳۔عتیق صدیقی۔سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔جامعہ نگر نئی دہلی۔۱۹۷۷ء۔ص۔۱۶۹

۹۴۔تہذیب الاخلاق۔یکم شوال۔۱۲۹۳ھ

۹۵۔مضمون مسلم صحافت جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد، روزنامہ اعتماد حیدرآباد ۲۰ دسمبر ۲۰۰۵ء

اختتامیہ

سرسید احمد خاں کا دور ہندوستانی مسلمانوں کے روشن مستقبل کی شروعات کی پہلی منزل تھا۔ سرسید نے اپنی صحافت اور اپنی کوششوں سے جس دور میں حشر برپا کیا وہ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم دور تھا۔ مغلیہ سلطنت کا پرچم ہندوستان کے فلک پر پوری آب وتاب سے لہرانے کے بعد روبہ زوال تھا اور ہندوستانی سیاست پر برطانوی طاقت کا اندھیرہ گہراتا جارہا تھا۔ یورپ کا صنعتی انقلاب اور دوسری مغربی تہذیبیں ہندوستانی آب وہوا پر گہرا اثر چھوڑ رہی تھیں۔ ان سبھی تبدیلیوں کا سیدھا سیدھا اثر زبان وادب پر بھی پڑا اور دوسری زبانوں کی صحافت کے علاوہ اردو صحافت بھی اس سے متاثر ہوئی۔ ایسے ہی وقت میں سرسید نے اپنے قلم کا سہارا لے کر اردو صحافت اور مضمون نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ سرسید ان چند غوروفکر کرنے والی ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی معاشرے اور انگریزوں کی سیاست کی گہرائی کو بھانپ لیا تھا۔ سرسید کو کہیں نہ کہیں یہ احساس ہو چکا تھا اور وہ وقت کے تقاضے کو سمجھ رہے تھے کہ اگر ہندوستانی قوم نے نئی طاقتوں، نئی تبدیلیوں، نئے میلانات اور نئی اقدار کو پوری طرح سے نہیں اپنایا تو ان کی زندگی بے مقصد ہو جائے گی اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس لیے ضروری تھا کہ عوام میں سماجی بیداری پیدا کی جائے۔

اس وقت کے ادب میں یہ صلاحیت باقی نہ تھی جو زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے نت نئے مسائل کا احاطہ کر سکے۔ ایسی صورت میں سرسید نے صحافت کو اپنا ہتھیار بنایا اور اس کے ذریعے اردو ادب اور صحافت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی اور اس کے گونا گوں مسائل پر بھی طبع آزمائی کی۔ بقول سید احتشام حسین:

''اس رسالے کے شائع کرنے کا خیال سرسید لندن سے لے کر آئے تھے۔ وہاں انھوں نے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر دیکھے تھے۔ ان کے اصلاحی اور ادبی مضامین نے انھیں متاثر کیا تھا اور انھیں اپنی تحریک چلانے کے لیے ایک ترجمان کی ضرورت تھی۔ اس طرح 'تہذیب الاخلاق' جدید نقطۂ نظر کی آواز بن گیا۔ اس نے نئی تعلیم، سائنس، عقل پرستی اور اصلاح رسوم کے لیے راہیں ہموار کیں اور وہ سوالات اٹھائے جس کے جواب پر آئندہ کی علمی اور ادبی ترقی کا انحصار تھا۔

تہذیب الاخلاق کے ذریعے نہ صرف اردو صحافت کو فروغ ملا بلکہ اردو نثر کے دامن میں بھی وسعت آتی گئی کیونکہ سرسید کی مضمون نگاری میں ہمیں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے موضوعات تو ملتے ہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے عام فہم اور سادہ اسلوب نے بھی لوگوں کو نثر کی نئی جہت سے روشناس کرایا۔ انھوں نے پر تکلف جملوں سے گریز کیا اور عام فہم نثر کو عام کیا۔ مضمون نگاری کی صنف براہ راست مغربی ادب سے آئی تھی اور سرسید نے بھی مغربی ادب سے استفادہ کیا جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے۔

''اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی بھی سرسید ہی تھے۔ ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام 'ایسے' ہے۔ یورپ سے ہی حاصل کی گئی ہے۔ یورپ میں اس کو ادبی نوع بنانے والا ایک اطالوی ادیب مانتین تھا۔ انگلستان میں اس کو مقبول بنانے والے کئی ادیب تھے جس میں بیکن اور ڈرائیڈن اور آگے چل کر ایڈیسن اور اسٹیل بھی تھے جن کے دو صحیفے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر دنیائے ادب میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔'' سرسید کے مضامین میں انگریزی مضمون نگاروں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسٹیل اور ایڈیسن کو سرسید نے تہذیب کا پیغمبر کہا ہے اور ان کے مضامین میں جملوں کی ساخت، برجستگی، غیر رسمی انداز، عام فہم اسلوب اور مضامین کی لطافت اور شائستگی کی خوب تعریف کی ہے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق نے بھی دیسی اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کا پورا رول ادا کیا۔ مغربی طرز پر ہی سرسید نے تہذیب الاخلاق میں سادگی اور

اصلاحی مقصد کو سب سے پہلا مقام دیا اور زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل کو بڑے ہی فرحت بخش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

رسالہ تہذیب الاخلاق میں صحافت کے اصولوں کی پاسداری نظر آتی ہے۔ بھلے ہی انھوں نے خبریں وغیرہ نہ شائع کی ہوں لیکن صحافت کے اصولوں سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ قارئین کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے تہذیب الاخلاق میں ہر قسم کے مضامین شائع کیے۔ اگر کبھی مضمون طویل ہو جاتا تو اسے دوسرے شمارے میں قسط وار شائع کیا جاتا تھا جس سے قارئین کو پرچے کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ مضمون کی طوالت کی وجہ سے کبھی کبھی انھوں نے پرچے کے متعلق ضروری اطلاعات بھی نہیں شائع کی ہیں۔ تہذیب الاخلاق میں جہاں مضامین پر سب سے زیادہ دھیان دیا جاتا تھا وہیں تہذیب الاخلاق کو اور کیسے بہتر بنایا جا سکے اس پر بھی نظر رکھی جاتی تھی اور آئے دن تہذیب الاخلاق میں رسالے کی تاریخ اور اس کے مضامین اور لکھنے والوں کے حالات شائع ہوتے تھے تاکہ لوگ اگر چاہیں تو اور بہتر مضامین بھیج سکیں۔

تہذیب الاخلاق کے مضامین پر جو تبصرے کیے جاتے تھے اسے من وعن شائع کیا جاتا تھا۔ سبھی لوگ اسے پڑھتے تھے اور سرسید کی ہمت کی داد دیتے تھے کہ اپنے ہی رسالے میں اپنے خلاف لکھے گئے مراسلے یا مضمون کو شائع کرنا واقعی بڑا کام ہے۔

عام طور سے اخباروں میں دوسرے مقابل اخبارات کی خبریں نہیں شائع کی جاتی ہیں لیکن تہذیب الاخلاق میں اس کے برعکس دوسرے اخبارات کے تعلق سے مضامین اور چیزیں نظر آجاتے ہیں۔ کبھی سرسید دوسرے اخبارات کی اعانت کا شکریہ کرتے ہیں تو کبھی کسی اخبار کی ترقی کی دعا کرتے ہیں اور ہفتے وار سے روزانہ میں تبدیل کرنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس طرح سے تہذیب الاخلاق نے اپنی صحافت کے اعلی معیار سے ثابت کر دیا کہ سیدھے اور سچے اصولوں کو بنیاد بنا کر بھی صحافت کی جا سکتی ہے۔

تہذیب الاخلاق میں کبھی کسی اخبار یا مخالفین کے سخت رویے کی خلاف غیر مہذب انداز میں نہیں لکھا گیا جب کہ مخالفین نے تو شرافت کی تمام حدوں کو توڑ دیا تھا اور سرسید اور تہذیب الاخلاق مضمون نگاروں کو زندیق، ملحد، شیطان کے خطابات سے نواز دیا لیکن سرسید قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے صبر اور استقلال کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے بھی اس کے رتبے اور عہدے کا پاس رکھا اور ہمیشہ عزت اور شرافت سے ذکر کیا۔

کبھی کبھی جب انگریز حکومت تک مسلمانوں کی ترقی اور تعلیم کے متعلق کوئی اہم بات پہنچانا ہوتی تھی تب تہذیب الاخلاق میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی وہ روئداد یا جلسے کی کارروائی شائع کی جاتی تھی تاکہ انگریز حکام بھی آسانی سے اسے پڑھ سکیں اور حکومت کو حقائق کا پتہ چل سکے۔ تہذیب الاخلاق میں کبھی مضامین کی جگہ پر جلسے کی کارروائی سرسید اور دوسرے مقررین کی تقریریں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کے شائع کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ عوام اسے اور آسانی سے سمجھ سکیں کیونکہ تقریری لہجہ بالکل آسان اور عام فہم ہوتا تھا اور اس طرح سیدھے سیدھے عوام اور مسلمانوں سے تعلق قائم کیا جا سکتا ہے جب کہ مضامین میں نثر کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لکھا جاتا ہے۔ اسی لیے جب بھی کبھی مسلمانوں کی ترقی اور تعلیم کے لیے کمیٹی کا جلسہ یا سرسید کا پروگرام ہوا اسے من وعن شائع کیا گیا۔ اس میں پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے سرسید سامنے موجود ہیں اور اس کے سامنے یہ ساری باتیں کہہ رہے ہیں۔ اپنے خطیبانہ انداز اور شفقت بھرے لہجے میں سمجھا رہے ہیں۔ برائی کے راستے سے واپس بلا رہے ہیں۔ ترقی اور روشنی کی سمت آنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ قارئین کو بھی پڑھتے وقت کافی اچھا لگتا ہے اور بات چیت کا یہ لہجہ مضمون نگاری سے زیادہ بہتر اثر کرتا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے بند ہونے پر نذیر احمد نے جو تقریر کی تھی۔ اس تقریر کو بھی اسی طرح سے شائع کیا گیا ہے۔ اس

تقریر میں نذیر احمد نے سرسید احمد پر خوب لعن طعن کی اور پھر سے شروع کرنے کا مشورہ دیا اور نذیر احمد کی اس تقریر نے سرسید کو تہذیب الاخلاق تیسری بار شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح تہذیب الاخلاق مضمون نگاروں اور قارئین کی آزادی رائے کا پورا خیال کیا جاتا تھا۔

سرسید نے صحافت کو ایک پیشے کے بطور نہیں اپنایا بلکہ اس سے ایک اہم کام لینے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ یہ اہم کام تھا مسلمانوں کو جدید رجحانات کی طرف مائل کرنا اور انھیں جاہلیت اور پسماندگی کے اندھیرے سے اٹھا کر تہذیب و ترقی کے اجالے تک پہنچانا۔ صحافت جب ایک مقصد کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی تھی تو ظاہر ہے کہ اس میں اصلاح اور مقصدیت کی طرف زیادہ زور دیا گیا اور عام اخباری مواد سے آگے بڑھ کر ایسے مسائل اور مضامین کو شائع کیا جن کے پیچھے مسلمانوں کی ترقی اور ان کی کامیابی کا مقصد پوشیدہ تھا۔ سرسید کی صحافت میں ان کا یہی مقصد ان کی صحافت اور اخبار نویسی کو تابانی بخشتا ہے اور وہ اردو صحافت کی تاریخ میں سب سے منفرد نظر آتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ کچھ مذہبی معاملات میں سرسید نے انتہائی لغو خیالات کا اظہار کیا اور مذہب کے سبھی اسرار و رموز کو فطرت اور سائنس کے اصولوں پر پرکھا جس کے لیے انھیں زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن دوسری طرف ان کی صحافت میں ہمیں آگے بڑھنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا بھی سبق صاف نظر آتا ہے اور مخالفتوں اور کشمکش کے دوران بھی انھوں نے ثابت قدمی سے اپنے کام کو پورا کیا اور اردو صحافت میں ایک روشن باب کا اضافہ کر گئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اردو صحافت کو سرسید نے ایک نئی سمت دی ایک نیا نظریہ دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ بالکل سچے اور جائز اصولوں اور مقصدی اور اصلاحی کام کو سامنے رکھ کر بھی صحافت کا پیشہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور مخالف ہواؤں کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ سرسید کی صحافت میں جہاں ادب کا گہرا شعور نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز دکھائی دیتا ہے وہیں صحافت کے زریں اصول اور جدید قوانین بھی نظر آتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں اردو صحافت کا ایک اہم نام ہے اور جس کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی ہے۔

کتابیات

۱۔اسماعیل پانی پتی (مرتبہ) مقالات سرسید۔نیشنل پرنٹرس، علی گڑھ ۶۳۔۱۹۶۲ء

۲۔اسماعیل پانی پتی (مرتبہ) مضامین سرسید۔(جلد ۱ تا ۱۶)۔نیشنل پرنٹرس، علی گڑھ ۱۹۶۵ء

۳۔انور صدیقی (مرتبہ) انتخاب مضامین سرسید۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۔۱۹۷۲ء

۴۔انور دہلوی (مرتبہ) اردو صحافت۔دہلی اردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۷ء

۵۔امداد صابری۔تاریخ صحافت اردو (پانچ جلدیں) جدید پرنٹنگ پریس، چوڑی والان دہلی ۔۱۹۵۳ء

۶۔امداد صابری۔روح صحافت۔مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی ۔۱۹۶۸ء

۷۔اصغر عباس۔سرسید کی صحافت۔انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۔۱۹۷۵ء

۸۔اصغر عباس (مرتبہ) انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۹۔الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۔۱۹۸۲ء

۱۰۔پروفیسر محمد شاہد حسین۔ابلاغیات۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۰۰۳ء

۱۱۔پروفیسر فضل الرحمٰن۔اردو انسائیکلو پیڈیا۔(جلد سوم) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۔۱۹۹۷ء

۱۲۔پی سی جوشی (مرتبہ) انقلاب ۱۸۵۷ء۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ نئی دہلی ۔۱۹۸۳

۱۳۔پروانہ ردولوی۔اردو صحافت کا استغاثہ۔حیا پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۔۱۹۹۴ء

۱۴۔ثریا حسین۔سرسید احمد خاں اور ان کا عہد۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی ۔۶

۱۵۔جاوید حیات۔مبادیات صحافت۔مکتبہ آزاد پٹنہ۔

۱۶۔حامد حسین قادری۔داستان تاریخ اردو۔عزیزی پریس آگرہ ۔۱۹۵۷ء

۱۷۔خلیق احمد نظامی۔سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۔۱۹۸۳ء

۱۸۔خلیق احمد نظامی سرسید احمد خان (ترجمہ اصغر عباس) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۷۱ء

۱۹۔خلیق احمد نظامی۔سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۹۳ء

۲۰۔رشید احمد صدیقی۔علی گڑھ ماضی و حال۔مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۔۱۹۷۰ء

۲۱۔سید احمد خاں۔آثار الصنادید۔دہلی اردو اکادمی، دہلی ۔۲۰۰۰ء

۲۲۔سید احمد خاں۔رسالہ اسباب بغاوت ہند۔یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ ۔۱۹۵۸ء

۲۳۔سید احمد خاں۔تاریخ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ شرافت حسین) ندوۃ المصنفین، دہلی ۔۱۹۶۳ء

۲۴۔سید احمد خاں۔سفر نامہ لندن (مرتبہ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب، لاہور ۔۱۹۶۱ء

۲۵۔سید احمد خاں۔سفر نامہ پنجاب (مرتبہ سید اقبال علی) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۱۹۷۹ء

۲۶۔سید عبداللہ۔میر امن سے عبدالحق تک۔چمن بک ڈپو۔اردو بازار دہلی ۔۶

۲۷۔سید عبداللہ۔سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۔۲۰۰۱ء

۲۸۔سید احتشام حسین۔اردو کی کہانی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۔۱۹۸۳ء

۲۹۔سید احتشام حسین۔اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۔۱۹۸۳ء

۳۰۔سید احتشام حسین۔ادب اور سماج۔کتب پبلشرز،بمبئی۔۱۹۴۸ء
۳۱۔سید سلطان محمود حسین۔اردو نثر کی تاریخ میں سرسید کا مقام۔نعمانی پریس، دہلی۔۱۹۷۷ء
۳۲۔سید ضیاء اللہ۔اردو صحافت ترجمہ وادارت۔کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور۔۱۹۹۴ء
۳۳۔سید راس مسعود۔خطوط سرسید۔نظامی پریس، بدایوں۔۱۹۲۴ء
۳۴۔سید امیر حسن نورانی۔سوانح منشی نول کشور۔خدابخش اورینٹل پبلک۔لائبریری، پٹنہ۔۱۹۹۵ء
۳۵۔سید نجابت علی۔سرسید احمد خاں۔ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم وسماجی بھلائی، نئی دہلی۔۱۹۶۹ء
۳۶۔سید اقبال قادری۔رہبر اخبار نویسی۔ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔۲۰۰۰ء
۳۷۔شان محمد۔سرسید تاریخی وسیاسی آئینے میں۔انوار بک ڈپو، علی گڑھ۔۱۹۶۷ء
۳۸۔عابد صدیقی۔ادب اور صحافت۔نیرنگ اکیڈمی، حیدرآباد۔۱۹۷۴ء
۳۹۔عبدالسلام خورشید۔کاروان صحافت۔انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔۱۹۶۴ء
۴۰۔عبدالسلام خورشید۔صحافت پاکستان وہند میں۔مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۶۳ء
۴۱۔عبداللطیف اعظمی (مرتبہ) سرسید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں۔علمی ادارہ جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۹۷۲
۴۲۔عبدالحق۔مطالعہ سرسید احمد خاں۔ایجوکیشنل بک ہاؤس۔علی گڑھ۔۲۰۰۱ء
۴۳۔عبداللہ خاں خویشگی (مرتبہ) مقالات سرسید۔نیشنل پرنٹرس، علی گڑھ۔۱۹۵۲ء
۴۴۔عتیق احمد صدیقی (مرتبہ) انتخاب مضامین سرسید۔اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔۲۰۰۳ء
۴۵۔عتیق احمد صدیقی۔سرسید احمد خاں بازیافت۔سرسید اکادمی علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی ۱۹۹۰ء
۴۶۔عتیق صدیقی۔سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔نئی دہلی۔۱۹۷۷
۴۷۔قطب اللہ۔مولانا آزاد کا نظریہ صحافت۔اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔۱۹۷۹ء
۴۸۔قدسیہ خاتون۔سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ۔کتابستان ۳، چک الہ آباد۔۱۹۸۱ء
۴۹۔محمد عتیق صدیقی۔اٹھارہ سو ستاون کے اخبار اور دستاویزیں۔مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی۔۱۹۶۶ء
۵۰۔محمد عتیق صدیقی۔ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔۱۹۵۷ء
۵۱۔محمد عتیق صدیقی۔گل کرسٹ اور اس کا عہد۔انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔۱۹۶۰ء
۵۲۔منظر اعظمی۔اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔اترپردیش اردو اکادمی۔لکھنؤ۔۱۹۹۶ء
۵۳۔مشتاق حسین۔مکاتیب سرسید احمد خاں۔یونین پرنٹنگ پریس، دہلی۔۱۹۶۰ء
۵۴۔مشتاق حسین۔سرسید کی نثری خدمات۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۲۰۰۵
۵۵۔منشی محمد سراج الدین (مرتبہ) لکچروں کا مجموعہ۔اسلامیہ پریس، لاہور۔۱۸۹۰ء
۵۶۔مظہر حسین۔علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ۔انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔۱۹۹۳ء
۵۷۔مظہر حسین۔مسلم معاشرے کی تشکیل نو (سرسید، نذیر، حالی، اور شبلی کے افکار کا مطالعہ) فینس آفسٹ پریس، فراش خانہ، دہلی۔۱۹۹۶ء
۵۸۔ڈاکٹر مسکین علی حجازی۔اداریہ نویسی۔مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰
۵۹۔نادر علی خاں۔اردو صحافت کی تاریخ۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔۱۹۸۷ء
۶۰۔نفیس بانو۔تہذیب الاخلاق تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔آرٹ ایکسپریس وارانسی۔۲۰۰۴ء

۶۱۔نفیس بانو۔سرسید کے فکری زاویے۔پہچان پبلیکیشنز الہ آباد۔۲۰۰۵ء
۶۲۔نورالحسن نقوی۔سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔۱۹۷۱ء
۶۳۔نورالحسن نقوی۔محمڈن کالج سے مسلم یونیورسٹی تک۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،دہلی۔۲۰۰۶ء
۶۴۔نذرالحفیظ ندوی۔مغربی میڈیا اور اس کے اثرات۔دارالعلوم ندوۃ العلماء،لکھنؤ۔۲۰۰۱ء

رسائل واخبارات

۱۔آج کل نئی دہلی ماہانہ اگست ۱۹۸۶ء
۲۔ آج کل نئی دہلی ماہانہ فروری ۱۹۷۵ء
۳۔آج کل نئی دہلی ماہانہ مئی ۱۹۹۳ء
۴۔آج کل نئی دہلی ماہانہ جنوری ۲۰۰۵ء
۵۔آج کل نئی دہلی ماہانہ مارچ ۱۹۹۴ء
۶۔آج کل نئی دہلی ماہانہ ستمبر ۱۹۹۹ء
۷۔ایوان اردو دہلی ماہانہ جنوری ۲۰۰۳ء
۸۔ایوان اردو دہلی ماہانہ اگست ۲۰۰۰ء
۹۔اردو دنیا نئی دہلی ماہانہ جون ۲۰۰۰ء
۱۰۔اعتماد حیدرآباد روزانہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۵ء
۱۱۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ ہفتے میں دو بار مختلف فائلیں
۱۲۔اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ہفتے میں دو بار مختلف فائلیں
۱۳۔تہذیب الاخلاق (سرسید) علی گڑھ پندرہ روزہ مکمل فائلیں ۱۲۸۷ھ سے ۱۳۱۴ھ
۱۴۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ جولائی ۱۹۸۷ء
۱۵۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ اکتوبر،نومبر ۱۹۸۸ء
۱۶۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ نومبر ۱۹۸۸ء
۱۷۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ مارچ ۱۹۹۶ء
۱۸۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ اپریل ۱۹۹۶ء
۱۹۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ جنوری ۱۹۹۰ء
۲۰۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ اکتوبر ۱۹۹۰ء
۲۱۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ خاص نمبر مارچ،اپریل ۱۹۹۸ء
۲۲۔تہذیب الاخلاق علی گڑھ ماہانہ دسمبر ۱۹۸۸ء
۲۳۔راشٹریہ سہارا نوئیڈا روزانہ ۲۱ر نومبر ۲۰۰۴ء
۲۴۔علی گڑھ میگزین علی گڑھ سالانہ خاص نمبر ۵۵۔۵۴۔۱۹۵۳ء

۲۵۔فکرونظر علی گڑھ سہ ماہی اکتوبر ۱۹۶۵ء

۲۶۔فکرونظر علی گڑھ سہ ماہی جنوری ۱۹۶۴ء

۲۷۔فکروتحقیق نئی دہلی ماہانہ جولائی ۲۰۰۵ء

۲۸۔کتاب نما نئی دہلی ماہانہ دسمبر ۲۰۰۵ء

۲۹۔قومی تنظیم پٹنہ روزانہ ۱۷ااکتوبر ۲۰۰۲ء

۳۰۔نیادور لکھنؤ ماہانہ اگست ۱۹۹۹ء

۳۱۔نیادور لکھنؤ ماہانہ جنوری ۲۰۰۶ء

۳۲۔ھما نئی دہلی ماہانہ (اے ایم یونمبر)اگست ۱۹۷۲ء

۳۳۔ھما نئی دہلی ماہانہ تحریک اردونمبر،جنوری۱۹۸۶ء

۳۴۔ھما نئی دہلی ماہانہ تحریک اردونمبر،دسمبر۲۰۰۰ء

۳۵۔ھما نئی دہلی ماہانہ تحریک اردونمبر،جنوری۲۰۰۱ء

☆ ہندی کتابیں

۱۔بھارتیہ پترکاریتا کااتہاس جے کے نٹراجن پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند۲۰۰۲

۲۔کہانی آوشکاروں کی بنسی لال یادو میناکشی پرکاش اجمیر۱۹۹۲ء

۳۔ہندی پترکاریتاویویدھ آیام(اول) ڈاکٹر ویدپرتاپ ویدک ہندی بک سنٹر،نئی دہلی۱۹۹۲ء

۴۔ہندی پترکاریتا کی روپ ریکھا(حصہ دوم)این سی پنت،منوج کمارجوشی
کنشکا پبلشرزڈسٹری بیوٹرس،نئی دہلی

۵۔میڈیااورساہتیہ سدھیش پچوری راج سورج پرکاشن نئی دہلی

☆English Books

1.A History of Muslim Philosophy part II M. M. Sharif, Low Price Publications, Delhi. 110052, 1961.

2. Aligarh First Generation, David Lely veld. Princeton, Jew Jersy

3. The Dynamix of Mass communication, Joseph R. Dominick, McGrawhill, New York, 1992.

4. Journalism Made Simple, David Wain Wright, Rupa. Paper Back, Darya Ganj, New Delhi

5.what Journalism is all about, M. R. Kamath, M. K. Rustomji, India Book House, Pvt. Ltd. Bombay, 1986.